پیشِ رفت

ڈاکٹر پریمی رومانی

پیش رفت

ڈاکٹر پریمی رُومانی

ڈاکٹر پریمی رُومانی کی تصانیف

- جدید اُردو شاعری: چند مطالعے
- اوراق
- تحریر و تقریر
- اِنتخابِ مضامین
- ردِ عمل
- تاثرات
- سنگِ میل (شاعری)
- برج پریمی - ایک مطالعہ
- افکارِ ولی
- ویژھنے (کشمیری)
- وراثت (کشمیری)
- برج پریمی: شخصیت اور فن

(زیرِ ترتیب)

پیش رفت

(اِنتقادی مضامین کا مجموعہ)

ڈاکٹر پریمی رُومانی

رچنا پبلی کیشنز

''تپسیا'' ۱/۳- نصیب نگر، پمپوش کالونی، جانی پور، جموں-۱۸۰۰۰۷

"تپسیا" ۳/۱ نصیب نگر، پمپوش کالونی، جانی پور، جموں

سالِ اشاعت: ۲۰۰۲ء

رچنا ایمہ نے
جے کے آفسٹ پریس، دہلی
سے چھپوا کر
رچنا پبلی کیشنز، جموں (توی)
سے شائع کیا۔

کمپوزنگ: کریسنٹ ہاؤس آف اِنفارمیشن ٹکنالوجی،
۲۶۷ رجوگی گیٹ، جموں-۱۸۰۰۰۱ (جے اینڈ کے)- فون: ۵۴۳۶۴۵

قیمت: دوسو روپے (-/۲۰۰ روپے)

تقسیم کار

- ☆ انجمن ترقی اُردو (ہند)، "اُردو گھر" راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
- ☆ اِدارۂ ادبیاتِ اُردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد-۵۰۰۰۸۲
- ☆ مکتبہء جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی-۴۰۰۰۰۳
- ☆ سٹار پبلی کیشنز، آصف علی روڈ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
- ☆ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹- گولہ مارکیٹ، دریا گنج، دہلی-۱۱۰۰۰۶
- ☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، لال کنواں، دہلی-۱۱۰۰۰۶
- ☆ کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۶۷-جوگی گیٹ، جموں-۱۸۰۰۰۱
- ☆ یاک بک چینل، پکاڈنگا، جموں-۱۸۰۰۰۱
- ☆ رچنا پبلی کیشنز، "تپسیا" ۳/۱- نصیب نگر، پمپوش کالونی، جانی پور، جموں-۱۸۰۰۰۷

اِنتساب

سُر گباشی شریمتی گنۂ وتی دیوی دھر

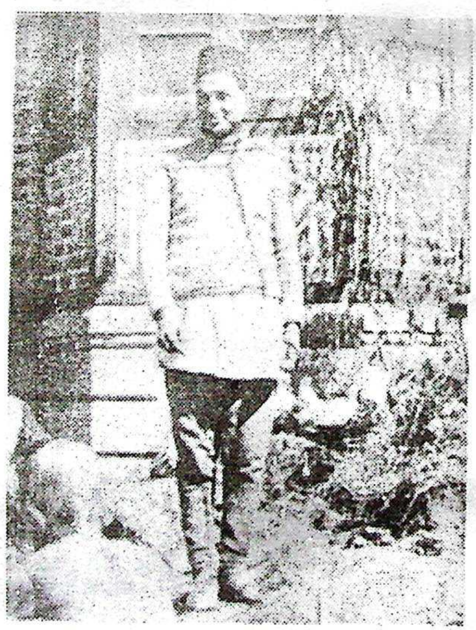
کے نام

جن کے شیتل سایوں کے آنچل میں

گزرے ہوئے لمحات آج بھی یاد آ رہے ہیں

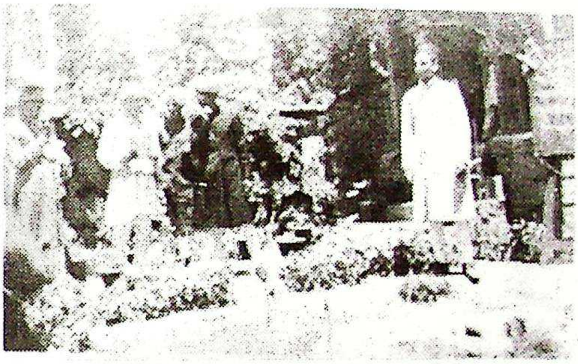
ڈاکٹر پریمی رُومانی

ترتیب

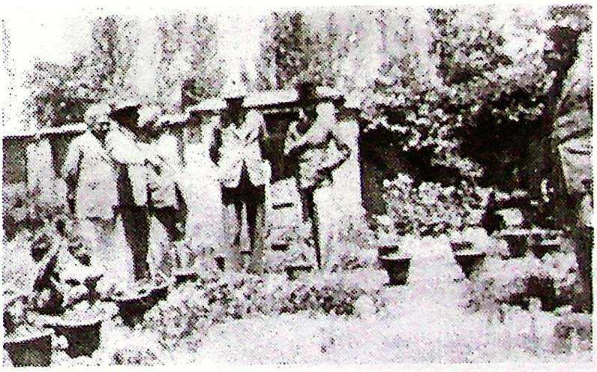


پنڈت شام لال ایمہ کی ایک یادگار تصویر

(مضمون صفحہ نمبر ۲۷ پر)



پنڈت شام لال ایمہ، ماڈل اسکول سرینگر میں پنڈت جواہر لال نہرو، ناظمِ تعلیمات خواجہ غلام السیدین اور دُوسرے ماہرینِ تعلیم کی موجودگی میں طلباء کو درس دے رہے ہیں



ماڈل اسکول سرینگر کے معائنے کے دوران میں پنڈت شام لال ایمہ (بالکل دائیں) ناظمِ تعلیمات خواجہ غلام السیدین اور دُوسرے ماہرینِ تعلیم کے ساتھ

اپنی بات

''پیش رفت'' کے نام سے اپنے تحقیقی وتنقیدی مقالات کا تازہ مجموعہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ان میں سے بعض مقالات مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور انجمنوں کی طرف سے منعقد کئے گئے سیمی ناروں میں پیش کئے گئے اور بعض نشر واشاعت کی منزلوں سے گزر کر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن چکے ہیں۔ یہ تمام مقالات کتابی صورت میں شائع کرنے سے مجھے بے حد مسرّت ہو رہی ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ''پیش رفت'' صرف ایک موضوع کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ اس میں عِلم وادب کے گونا گوں موضوعات پر مقالات شامل ہیں۔ میں اِن مقالات کو بڑی محنت سے ضبطِ تحریر میں لا چکا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری یہ کوشش پسند کریں گے۔

کشمیر میرا مادرِ وطن ہے۔ اِس لئے اپنے تخلیقی سفر کے دوران میں کسی نہ کسی طرح سے اس کی تصویر شعوری یا غیر شعوری طور پر میری تحریروں میں اُبھرتی ہے۔ اِس کتاب کے مطالعے سے بھی آپ کو اِس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

میں نے اُردو کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان کے بعض اہم اور قد آور شاعروں اور نثر نگاروں

پر بھی وقتاً فوقتاً خامہ فرسائی کی ہے۔ ان میں سے بعض اہم شخصیات کو اِس کتاب میں شامل کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ تا کہ کشمیری نہ جاننے والے قارئین بھی کشمیری زبان وادب کی صحت مند اَقدار اور ادبی ورثے سے آگہی حاصل کر سکیں۔ میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں' یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔

میں اپنے عزیز دوست جناب امین بنجاؔرا کا شُکر گزار ہوں جنھوں نے کریسنٹ ہاؤس آف اِنفارمیشن ٹکنالوجی، جموں کے زیرِ اہتمام اِس کتاب کی کمپوزنگ اور لے آؤٹ تیار کروانے میں ذاتی دِلچسپی لی اور مجھے کتابت کی طوالت اور دُشوار گزار مراحل سے نجات دِلائی۔ اُن کا خلوص اور اُن کی ہمدردی' میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا ہوں۔

آخر میں' میں اپنے قارئین پر یہ ذمہ داری عائد کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ وہ اِن مقالات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کی زحمت کریں اور مجھے اپنی گراں قدر رائے سے نوازیں۔

۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر پریمی رُومانی
''تپسیا'' ۳/انصیب نگر، پمپوش کالونی،
جانی پور، جموں-۱۸۰۰۰۷ (جے اینڈ کے)

اقبال کے فکروفن کے اثرات کا جائزہ

اقبالؔ کے معاصرین میں بڑے قد کے شاعر، ادیب، عالم اور مفکر ہوئے ہیں جنھوں نے شعروادب کے دائرے میں یا اِس دائرے سے باہر کافی کارنامے انجام دیئے۔ اُن میں بعض لوگ اپنے اپنے شعبوں میں منفرد حیثیت کے مالک تھے لیکن اِس کے باوصف اقبالؔ اپنے فکروفن کی دولت کی بدولت ایک بڑے فنکار ثابت ہوئے، جنھوں نے کسی نہ کسی طرح نہ صرف اپنے معاصرین بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کیا۔ اکبرالہ آبادی نے اپنے ایک خط میں اقبالؔ کی بصیرت کی تحسین کرتے ہوئے لکھا ہے:-

> ''آپ کی نظم میں نے پڑھی، ماشاءاللہ چشمِ بدٌور۔ بعض اور بزرگوار بھی تھے۔ سب نے تعریف کی لیکن مجھ پر بہت اثر ہوا۔ وہ اثر باعثِ سکونِ خاطر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چشمِ بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر میں بلا تجربہ دُنیا آپ کے دِل کی نظر کم سے کم، اخلاقی حقایق کی طرف ہے۔''[۱]

یا اسی طرح محمد علی جناح کے ایک خطبے میں ذیل کے جملے قابلِ توجہ ہیں:-

> ''اگر میری زندگی میں ہندوستان میں اِسلامی ریاست قایم ہوگئی اور مجھے اپنے اعزاز کے اِنتخاب کا حق دِیا گیا تو میں اسلامی ریاست کے

۱۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: بحوالہ اقبالؔ سب کے لئے، ص ۵۰۹

نگرانِ اعلیٰ بننے پر کلامِ اقبالؔ کو ترجیح دُوں گا''[1]

اِن اقتباسات سے علاّمہ کے اَفکار اور فنی عظمت کے قبولِ عام اور اثرات کا ہلکا سا اِشارہ ہوتا ہے۔

شعروفن میں علاّمہ کے اَفکار وخیالات اور فنی تجربوں کے اَثرات علاّمہ کی شاعری کے اِبتدائی دور سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ بڑے بزرگ شاعروں مثلاً سرورؔ جہاں آبادی، نادرؔ کاکوروی، پنڈت برج نرائن چکبستؔ سے قطع نظر شاعروں کی ایک پوری نسل ہے جنہوں نے علاّمہ سے کسی نہ کسی حیثیت سے اِکتسابِ فیض کیا۔ اُن شعراُ میں سیمابؔ، امین حزیںؔ، جگرؔ مُرادآبادی، حفیظؔ جالندھری، اثر صہبائی، آنند نرائن مُلاّؔ، ماہرالقادری، صوفی تبسّم، اَسد ملتانی، احسان دانش، ن م راشدؔ علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزادؔ اور شورشؔ کاشمیری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اِقبالؔ کے یہ اَثرات اُن شعراُ کے یہاں موضوع، مواد، ہیئت اور اُسلوب کے اعتبار سے نظر آتے ہیں۔ اِقبال سے متاثر ہونے والے شعراُ نے نہ صرف مختلف شعری تجربوں میں اِقبال کی تقلید کی بلکہ اِقبال نے جن موضوعات کو بطورِ خاص پیش کیا تھا، اُن موضوعات پر اُن لوگوں نے بھی اپنا اِظہارِ خیال کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اِقبال سے قبل بھی مغرب کی تقلید میں شاعری کو ایک نئی نہج عطا ہوئی تھی لیکن اُن میں اِس قدر ہمہ گیری، وُسعت اور تنوع پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ کام اِقبال کے ہاتھوں انجام پایا۔ اِقبال کا سب سے بڑا کارنامہ انسانی مسایل کو فلسفیانہ آہنگ کے ساتھ پیش کرنا رہا ہے۔ اِقبال رجائیت کے شاعر تھے اور اُنہوں نے اپنی شاعری کو اِنسانی زندگی کے ساتھ پیوست کر کے پیش کیا۔ فنی اعتبار سے بھی وہ ایک ترقی پسند ذہن رکھتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے بھی اِس میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اُن کے یہاں صنائع بدائع کی طلسم کاری کے بجائے فکر کی گہرائی ملتی ہے۔ اس دھاگے کو لے کر دُوسرے شاعروں نے اِس کو آگے بڑھایا اور اُن نقوش میں رنگ آمیزی کی جو اِقبال نے چھوڑے تھے۔

اِقبال سے متاثر ہونے والے فنکاروں میں سیمابؔ اکبرآبادی کا نام سرفہرست ہے۔ سیمابؔ نے اِقبال کے فلسفیانہ تفکرات میں سے خودی، عشق، عقل، حیات وکائنات، حُسن، اِنسان، خدا وغیرہ کو لیا اور اُن پر اپنا اِظہارِ خیال کیا۔ یہ صحیح ہے کہ سیمابؔ فلسفیانہ تفکّر کے اعتبار سے اِقبال سے بہت پیچھے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ اُن کو وہ لب ولہجہ حاصل نہ ہو سکا جو صرف اِقبال کا ہے، لیکن اُن کے یہاں اِن موضوعات کو

---

[1] ڈاکٹر فرمان فتح پوری: بحوالہ اقبال سب کے لئے، ص ۵۱۰

برتنے کی اچھی کوششیں نظر آتی ہیں۔ سیمابؔ بھی علاّمہ کی طرح عشق کو عقل سے برتر سمجھتے ہیں اور یہ خیال یقیناً اِقبال سے مستعار لیا گیا ہے۔ سیمابؔ کے مطابق عاقبت اصل زندگی ہے اور یہ زندگی محض ایک تجربہ گاہ۔ اِس خیال کا ایک منضبط اظہار اِقبال کے یہاں ملتا ہے۔ سیمابؔ خُدا کی ذات پر بھروسہ کرنے کا درس دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی اِقبال کی طرح خود شناسی کا درس بھی دیتے ہیں۔ اِن مباحث پر اِظہار بہ ذاتِ خود اِقبال کی فکر کے اثر کا نتیجہ ہے۔ اِتنا ہی نہیں سیمابؔ نے اِقبال کی تقلید میں وطنی اور قومی شاعری بھی کی ہے۔ سیمابؔ کی اِس طرح کی شاعری میں اِقبال کے دورِ اوّلین کی شاعری کا پرتو بطورِ خاص نظر آتا ہے۔ سیمابؔ کے یہاں ایسے خیالات کی کمی نہیں ہے جہاں وہ فرنگی شاطروں کی چالبازیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اِقبال ہی کی طرح اپنے اہلِ وطن کو بغاوت کے آداب سکھاتے ہیں اور فرنگی چالوں سے خبردار کر کے اُنہیں آمادۂ پیکار کرتے ہیں۔ بغاوت کی یہ تپتی ہوئی آگ اِقبالؔ کے اثرات ہی کا نتیجہ ہے۔

سیمابؔ کی شاعری میں ایک اہم رجحان مناظرِ فطرت کی عکاسی ہے، جو علاّمہ کا ایک بہت ہی عزیز میدان ہے۔ پہاڑوں اور جھرنوں، آبشاروں اور مرغزاروں کی کتنی ہی لازوال تصویریں سیمابؔ کے یہاں نظر آتی ہیں، جن کا ذکر اِقبال کے یہاں بھی بطورِ خاص ملتا ہے۔ سیمابؔ بھی اِنسان کو فطرت کے بغیر نامکمل سمجھتے ہیں۔

سیمابؔ کی نظمیہ شاعری کا ایک بڑا حصّہ فلسفیانہ اُفکار پر محیط ہے۔ سیمابؔ کی نظم ''فریاد'' شکوہ کے رنگ میں اور اُسی لب و لہجے میں ملتی ہے۔ اِقبالؔ نے اِسلام کے علاوہ دُوسرے مذاہب کے تئیں بھی احترام اور عقیدت کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ خاص طور پر دُوسرے مذاہب کے پیشواؤں کی تعریف و توصیف کی ہے۔ چنانچہ رام چندر جی، گرونانک، مہاتما بدھ وغیرہ عنوانات سے اُنہوں نے خوبصورت نظمیں لکھیں۔ سیمابؔ کے یہاں بھی ایسی نظمیں ملتی ہیں اور یہ اِقبال ہی کے اثرات کا نتیجہ ہے کہ اُنہوں نے شری کرشن، گوتم بُدھ اور گرونانک جیسی نظمیں لکھیں جن میں اِقبال کی نظموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اِقبالؔ کی نظمیہ شاعری کا وقیع حصّہ بچوں کی نظموں پر محیط ہے اور نہایت ہی آسان بحور میں آسان الفاظ کے تانے بانے سے بچوں کے نغمے گائے ہیں، جن میں بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ سیمابؔ یہاں بھی اِقبالؔ کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ دُعا، بچوں کی

دُعا، بُلبُل اور گُلاب، جگنو اور بچہ، برسات جیسی ہلکی پھلکی نظمیں اِقبالؔ کی' بچے کی دُعا، شمع، جگنو وغیرہ کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

فنی سطح پر بھی یہ اقبالؔ کے ہی اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ جو سیمابؔ کے یہاں موسیقیت ملتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فنی سطح پر بھی سیمابؔ، اِقبالؔ کی بلندی پر پہنچ نہیں پائے لیکن سیمابؔ بھی علایم، پیکر سازی، تراکیب اور تشبیہہ و استعارے کے استعمال سے وہی سماں باندھنے کی کوشش کرتے ہیں جو اقبالؔ کرتے ہیں۔ سیمابؔ کے یہاں لالۂ صحرا، بانگِ جرس، خودی، رازِ ہستی، آدمِ خاکی، شاخِ گل، نورِ آفتاب، عرشِ بریں، موجِ دریا، نوائے عشق اور ایسے ہی بے شمار علایم و استعارے ملتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیمابؔ نے فنی سطح پر بھی اقبالؔ سے اکتسابِ فیض کیا ہے اور اِسے اپنے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

امینؔ حزیں نے شاعری کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگرچہ انہوں نے کبھی کسی کی تقلید نہیں کی لیکن وہ علامہ سے ضرور متاثر رہے ہیں۔[1] امینؔ حزیں کی شاعری کا ایک بڑا موضوع تصورِ خودی ہے، اگرچہ اُن کا راستہ اِقبالؔ سے الگ ہے۔ امینؔ حزیں نے اپنے اشعار میں اثباتِ خودی کا بار بار اظہار کیا ہے اور وہ بھی علامہ کی طرح ضبطِ نفس کو انسانی بہبود کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ اقبالؔ کے نظریئے سے اس درجہ اختلاف کرتے ہیں کہ وہ ایقان کے نظریئے کے قایل نظر آتے ہیں اور اقبالؔ خودی کے مبلّغ۔ وہ خودشناسی کے ساتھ ساتھ یقینِ محکم پر بھی زور دیتے ہیں اور اس طرح سے وہ ایقان کو خودی سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اقبالؔ اور امینؔ حزیں کے یہاں عمل کے تصور کی وضاحت بار بار ملتی ہے۔ دونوں ہی ذوقِ عمل پر زور دیتے ہیں۔ امینؔ حزیں اس تصور کے سلسلہ میں اقبالؔ سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ اُن کی واضح طور پر تقلید کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ تقدیر پرستی کے خلاف ہیں اور ایسے لوگوں کو بے عمل قرار دیتے ہیں جو صرف تقدیر کا رونا روتے ہیں۔ یہ سبق اُنہوں نے یقیناً اقبالؔ سے حاصل کیا ہے۔

اقبالؔ کا ایک اہم تصور نظریہ حیات و کائنات ہے جس کے لئے وہ مسلسل کشمکش کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ امینؔ حزیں کا مطالعہ اگرچہ اُس قدر گہرا نہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے انداز میں اُنہی خیالات کا اِظہار کرتے ہیں جو اقبالؔ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اقبالؔ ہی کی تقلید میں وہ طریقہ خانقاہی اور سکونِ گوشہ نشینی کو

[1] اقبال ریویو۔ جلد ۱۷۔ جنوری ۱۹۷۷ء، نمبر ۴۔ ص ۵۹

پسند نہیں کرتے ہیں۔

امین حزیں، اقبال سے اِس درجہ متاثر تھے کہ اُنہوں نے شعوری طور پر اِقبال کے رنگ کو اپنایا اور اپنے انداز میں وہی مفکّرانہ لہجہ پیدا کرنے کی کوشش کی جو علّامہ سے مخصوص ہے۔ چنانچہ وہ بہت سی ایسی تراکیب استعمال کرتے ہیں، جو اقبال کو پسند تھیں۔ جیسے قصۂ ناتمام، دامنِ گلشن، حسنِ فطرت، نورِ سحر یا علایم میں حُسن، عشق، خودی، عمل، حیات وغیرہ۔ امین حزیں کے یہ علایم یا استعارے کسی حد تک اُنہیں اِقبال کے لب و لہجے میں بات کرنے کا شرف بخشتے ہیں اور اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے میں کامیاب کرتے ہیں۔ اگر چہ امین کا کلام بہت مختصر ہے لیکن اُن کی شاعری کے تیور دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اُنہوں نے شعوری طور پر علّامہ کے اَثرات نہ صرف قبول کئے تھے بلکہ اُن کو جذب کر کے اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

اِقبال کے مقلّدین میں جگر مُرادآبادی بھی ہیں۔ جگر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، لیکن اُنہوں نے اپنی غزلوں کو محض عشق و عاشقی کے روایتی موضوعات تک محدود نہیں رکھا۔ اُن کے یہاں فکری اور فنی لحاظ سے کئی ایسی باتیں ملتی ہیں جو اِقبال کا راست اثر معلوم ہوتی ہے۔ آل احمد سرور صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جگر کا تصوّرِ عشق اگر چہ اِقبال کے تصوّر کی گہرائی کو نہیں پہنچتا مگر لطافت میں اِقبال سے کم نہیں۔ [1] عشق، اِقبال کا ایک زبردست موضوع ہے جسے وہ وسیع معنوں میں اِستعمال کرتے ہیں۔ اقبال کے یہاں ساری کائنات کی رونق عشق کی بدولت ہے۔ جگر بھی عشق کی تشنہ کامی کے لئے زہر کو آبِ حیات سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے عشق کی بات کرتے ہیں جو وصل سے نہیں بلکہ ہجر سے شادمانی حاصل کرتا ہے۔ یہ ایسا ذریعہ ہے جو چاہے جانے والے سے زیادہ چاہنے والے کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔

اِقبال کی طرح جگر مُرادآبادی بھی حُسن پرست ہے۔ اگر چہ شروع شروع میں اُن کے یہاں حُسن کا تصوّر بالکل روایتی ہے لیکن بعد میں وہ حُسنِ مطلق کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ اِقبال زندگی کے شاعر ہیں اور وہ زندگی میں جوش، ولولہ اور ہنگامہ چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اِسے اِمروز وفردا کے پیمانے میں نہیں ناپتے۔ جگر نے اِقبال کے دُوسرے تصوّرات کی طرح زندگی کے تصوّر کے بارے میں اِقبال سے فیضان حاصل کیا ہے۔ وہ بھی جمود سے نفرت اور حرکت سے محبت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ موت پر زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جگر کا تصوّرِ زندگی فلسفے کی آنچ میں تپا ہوا نہیں ہے لیکن اِس بات میں

---

۱ جگر مُرادآبادی: آتشِ گُل ص ۴۸

دور ائے نہیں کہ جگر زندگی جینے کا سبق دیتے ہیں۔ جگر نے زندگی کی حرارت کا یہ سبق اقبالؔ ہی سے سیکھا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اقبالؔ غزل کے ساتھ ساتھ نظم کے ذریعے اپنی باتوں کا اظہار کرتے ہیں اور یہ اظہار اقبالؔ نے اپنے کلام میں رمز و کنایہ کا سہارا لے کر کیا ہے۔

عقل کا تصوّر بھی اقبالؔ سے ہی متاثر نظر آتا ہے۔ جگر عقل کو عشق سے کم تر درجہ دیتے ہیں۔ اسی طرح حیات و کائنات کے بارے میں جگر کا خیال یہ ہے کہ زندگی جینے کے لئے درد و غم کا جذبہ پاس ہونا لازمی ہے۔ جگر کا خیال ہے کہ آرزو کا نغمہ ہو تو حیات بھی رقص کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جگر مُرادآبادی نے جن تراکیب کا استعمال کیا ہے اُن میں سے بیشتر ایسی ہیں جو جگر سے پہلے اقبالؔ کے یہاں ملتی ہیں۔ حُسنِ سراپا، سکوتِ شوق، مقامِ عشق، اَسرارِ محبت، فکرِ حیات، آفتابِ شوق، موجِ طوفان، نورِ حیات اور ایسی ہی کتنی تراکیب ہیں جو کلام اقبالؔ سے حاصل کی ہوئیں معلوم ہوتی ہیں اور جنہوں نے کلامِ جگر میں نئے مفاہیم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

جگر نے فارسی میں بھی شعر کہے ہیں۔ اُن کا بیشتر کلام حافظؔ، بیدلؔ، غالبؔ اور نظیریؔ کے رنگ میں ملتا ہے، لیکن کلام کا بیشتر حصہ اقبالؔ کے رنگ سے الگ نہیں۔ جگر کی بیشتر فارسی غزلوں اور نظموں میں ردیف اور قافیے کی تکرار بھی ملتی ہے اور بیشتر جگہوں پر ہم خیالی کے جذبات بھی نظر آتے ہیں۔

اقبالؔ کے اہم معاصرین میں حفیظؔ جالندھری کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ حفیظؔ کی شاعری جہاں اکبرؔ الہٰ آبادی، چکبستؔ، جوشؔ، اخترؔ شیرانی، حسرتؔ موہانی، اصغر گونڈوی اور جگر کے رنگ سے متاثر ہے وہاں علاّمہ کی آواز اور اُن کے رنگ کو اُن کے یہاں اچھی طرح سے پہچانا جاسکتا ہے۔ حفیظؔ اپنے بچپن سے ہی علاّمہ کی شاعری سے متاثر تھے چنانچہ وہ عقیدت کی حد تک اُنہیں چاہنے لگے تھے۔ اُنہوں نے جب شعر کہنا شروع کیا تو اقبالؔ سے اِس درجہ متاثر تھے کہ اُن کے رنگِ سُخن کو اپنانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ اس کا اظہار حفیظؔ نے اپنے اشعار میں خود بھی کیا ہے۔ اقبالؔ کے تئیں اپنی عقیدت کے بے شمار پھول نچھاور کرنے کے باوصف حفیظؔ نے موضوع اور ہئیت کے اعتبار سے اقبالؔ کے رنگ و آہنگ کو شعوری طور اپنانے کی کوشش کی۔ حفیظؔ کی شاعری کا ایک رنگ مناظرِ فطرت ہے۔ فطرت کے جلوۂ صد رنگ کی حشر سامانی کا ذکر جس طرح حفیظؔ کے یہاں نظر آتا ہے، وہ اقبالؔ کے نغموں کی فضا آفرینی، نغمگی، سلاست اور سوز و گداز ... حفیظؔ کی نظم "..." اقبالؔ کی نظم "ہمالہ" کی یاد دلاتی

ہے۔ اِسی طرح حفیظؔ کی نظم تاروں بھری رات، اِقبالؔ کی نظم بزمِ انجم کا ایک حسین عکس نظر آتی ہے۔ حفیظؔ کی نظموں میں ہلال چاند، برسات، بہار — وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں اِقبالؔ کی اِس قبیل کی نظموں کا حُسن اور دِلآویزی سامنے آتی ہے۔

حفیظؔ جالندھری کا سب سے بڑا کارنامہ ''شاہنامہ اِسلام'' ہے۔ اس میں تاریخ اسلام کے اہم واقعات اِسلامی روایات کی عظمت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس نظم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علاّمہ کے اِسلامی تصوّرات کا نہ صرف مطالعہ کر چکے تھے بلکہ اُن سے متاثر بھی تھے اور اِسلام کے تئیں اپنی عقیدت کا اِظہار اُسی شد و مد اور جوش و سرگرمی کے ساتھ کیا ہے جس کی مثالیں کلام اِقبالؔ میں ملتی ہیں۔ کلام اِقبالؔ کا ایک حصّہ بچوں کی شاعری سے متعلق بھی ہے، جہاں اِقبالؔ بچوں کو حب الوطنی اور اِنسان دوستی وغیرہ کا سبق سکھاتے ہیں۔ یہ نغمے آج تک گائے جاتے ہیں۔ اِقبالؔ نے کئی کہانیوں کے منظوم ترجمے بھی کئے ہیں۔ 'ایک پہاڑ اور گلہری' 'ترانہ ہندی' 'ایک مکڑا اور مکھّی' 'بچے کی دُعا' 'ایک گائے اور بکری' 'ہمدردی' اور اِس طرح کی بہت سی نظمیں ہیں جن میں بچوں کا دِل بہلاتے ہوئے بڑی بڑی باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ حفیظؔ کا ایک پورا مجموعہ کلام ''حفیظؔ کے گیت اور نظمیں'' علاّمہ اقبال کے تتبع میں اُسی احساس کی ترجمانی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان نظموں میں کم و بیش اُنہی باتوں کا اعادہ ملتا ہے جو علاّمہ کے موضوعات ہیں۔

اگرچہ کلامِ حفیظؔ کی اپنی انفرادیت ہے اور وہ بڑے ہی خوبصورت استعارے، علامتیں، تشبیہات کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی بحور اور سیدھے سادے الفاظ کے اِستعمال پر قادر ہیں لیکن یہاں بھی وہ اپنے مرشدِ فن اِقبالؔ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اِقبالؔ نے جس زبان کا اِستعمال اپنی شاعری میں کیا، اُس کا اثر اُن کے معاصرین اور آیندہ آنے والی نسلوں پر ہوا۔ حفیظؔ نے بھی اُن اثرات کو قبول کیا اور اپنی شاعری کو سنوارا۔ کلامِ اِقبال کا ایک بڑا اثر جو حفیظؔ کی شاعری میں ملتا ہے، وہ اُن کے حِسیاتی محاکات ہیں۔ اِقبالؔ سے یہ سبق سیکھ کر اُنہوں نے اپنی علامتوں میں تمثیل کی تازہ کاری پیدا کی اور نئی امیجری کے اعلےٰ نمونے پیش کئے۔

آنند نرائن مُلاؔ 'اِقبالؔ سے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اِقبالؔ کے ساتھ ذہنی رشتہ ۱۹۲۷ء کے آس پاس قایم ہوا۔ اِبتدا میں اُنہوں نے اِقبالؔ کے فارسی کلام کا ایک حصّہ انگریزی میں ترجمہ کیا جسے

کافی داد و تحسین حاصل ہوئی۔ اُس کے بعد وہ اِقبالؔ سے برابر فیض حاصل کرتے رہے۔ ملاؔ کا اِبتدائی کلام اِقبالؔ کی شاعری کی طرح قومیت اور وطنیت کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ وہ بھی علامہ کے دورِ اوّلین کی شاعری کی طرح ہندوستان کے قدیم کلچر پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی مشہور نظم ''زمینِ وطن'' اِقبال کے ''ترانہ ہندی'' کا عکس معلوم ہوتی ہے اور وہ بھی ہندوستان کے قدرتی مناظر، کوہ و دریا اور جھرنوں اور جھیلوں کی اُسی طرح مصوری کرتے ہیں جس طرح اِقبالؔ اپنی نظم میں کرتے ہیں۔ آگے چل کر موضوعاتی حد تک اِقبالؔ اور ملاؔ کے کلام میں ایک عجیب مماثلت کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں جذبے اور احساس کی ہم آہنگی بھی نظر آتی ہے چنانچہ گرونانک، شاعر، شمع، اِنساں اور ارتقا، کے عنوانات سے دونوں شعراُ کے یہاں نظمیں ملتی ہیں جن میں ایک ہی طرح کے خیالات کو مختلف پیرائے اِظہار میں بیان کیا گیا ہے۔ کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں ایک ہی رنگ نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملاؔ اپنے کلام کے فلسفے کی اُن باریکیوں کو سنوار نہیں سکے جو کلامِ اِقبال کا ایک زبردست عنصر ہے۔ ملاؔ غزل کے بھی شاعر ہیں اور غزل میں وہ روایتی لکیروں کو پیٹنے کے بجائے روایت سے اِنحراف کر کے ایک الگ راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اِس کے باوجود وہ موجودہ معاشرے کے کرب کو اپنے لہجے کے مخصوص تیکھے پن سے ظاہر کرتے ہیں اور اپنے کلام کو محض ردیف و قافیہ کی قید تک پابند نہیں رکھتے۔ یہ نقطہ اُنہوں نے اِقبالؔ ہی سے سیکھا ہے۔ ملاؔ کے اسلوب میں ایک عجیب نرمی و گھلاوٹ کا احساس ہوتا ہے جو اُن کے تفکّر کا بھی ایک حصّہ ہے۔ اِقبالؔ بڑے شاعر اِس لئے ہیں کہ اُنہوں نے بڑے اور باریک موضوعات کو غزل کے رمز و کنایہ میں بیان کیا ہے۔ ملاؔ نے بھی اُنہی نقوش پر چل کر اپنا مقام بنالیا ہے۔ علاّمہ کی غزل جو بظاہر موسیقی اور لَے کا ایک خاص انداز لئے ہوئے ہے، ملاؔ کے یہاں اس آواز کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور معنی کی نئی پرتیں کلامِ اِقبالؔ ہی کی طرح کھل جاتی ہیں۔ ملاؔ اور اِقبالؔ کے خیالات کی ہم آہنگی اُن مقامات پر واضح ہو جاتی ہے جہاں ملاؔ خودی، حیات و کائنات اور عمل کے پیچیدہ موضوعات کو برتتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ملاؔ کو جو چیز اِقبالؔ کے قریب اور اُن کے اَثرات کے ماتحت لے آتی ہے وہ اُن کی غزلوں کی معنویت اور گہرائی ہے۔ ملاؔ نے خالی کھولی جذباتیت سے کام نہیں لیا ہے بلکہ کلامِ اِقبالؔ سے درس لے کر زندگی کے حقائق کو پیش کیا ہے اور اِس طرح سے وہ اِنسانی زندگی کی پیچیدگیوں کا اِظہار فنی قالب میں ڈھال کر کرتے ہیں۔ ملاؔ کے یہاں زندگی، کلچر اور سماج کے بارے میں جو نظریات ملتے ہیں وہ

بہت حد تک کلامِ اِقبالؔ میں نظر آتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اِقبالؔ کی روایات کو آگے بڑھانے کی جستجو کرتے ہیں اور اِس میں ایک خاص قسم کی انفرادیت پیدا کرتے ہیں

آثرؔ صہبائی، اِقبالؔ کے ایک اور پیروکار ہیں۔ آثرؔ صہبائی نے اپنی آپ بیتی میں علاّمہ کے اَثرات کا ذِکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

''علاّمہ اِقبالؔ کی شخصیت بِالعموم اور اُن کی غیر فانی شاعری بِالخصوص میری زندگی اور شاعری پر اَثر انداز رہی ہے۔''[۱]

آثرؔ صہبائی کی شاعری میں تصوّرِ عشق، تصوّرِ حُسن، تصوّرِ حیات وغیرہ اِقبالؔ کے اَثرات کا نتیجہ ہیں۔ آثرؔ بھی اِقبالؔ کی طرح عاشق ہیں اور حقیقت سے عشق کرتے ہیں۔ وہ بے کیف زندگی پر جنونِ عشق کو برتر سمجھتے ہیں اور عشق کو سرورِ جاوداں قرار دیتے ہیں۔ علاّمہ ہی کی طرح آثرؔ عشق کے نشے میں بصیرت کی آنکھ کھولتے ہیں۔ اِسی طرح آثرؔ صہبائی کا تصوّرِ حُسن اِقبالؔ کی تعلیمات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ کلامِ اقبالؔ میں حُسن کی کیفیات بکھری ہوئی ہیں۔ اُن کے کلام کا بیشتر حصّہ رُوحِ جمال سے آسودہ ہے۔ آثرؔ صہبائی حُسن کی حقیقت علاّمہ کی طرح ساری کاینات میں دیکھ لیتے ہیں۔ کاینات کا ہر ذرّہ حُسن ہے۔ عاشق اُسی نور کی تلاش کرتا ہے جو اُس کا مرکزِ تمنا ہے۔ وہ اِقبالؔ ہی کی طرح نسوانِ حُسن اور دُوسرے مظاہرِ جمال کو محض استعارے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ آثرؔ کا تصوّرِ حُسن، حُسنِ مطلق کی تلاش ہے۔ یہ تلاش اِقبالؔ کی فکر کے مطالعے سے حاصل ہوئی ہے۔ حیات کے بارے میں آثرؔ صہبائی کا نظریہ یہ ہے کہ مذہب کی رُوح حق جوئی، حق گوئی اور حق پرستی ہے۔ اِقبالؔ کے یہاں اُس حق کی تلاش اِسلامی تعلیمات کا بڑا فیضان ہے۔ آثرؔ، اِقبالؔ ہی کی طرح درسِ عمل دیتے ہیں اور وہ کبھی فرار میں پناہ نہیں لیتے ہیں۔ آثرؔ نے تکنیکی اعتبار سے اِقبالؔ کی خوشہ چینی کی ہے اور اپنے خیالات کو تشبیہہ اور استعارے کے ذریعے سے پیش کیا ہے۔ جس طرح اِقبالؔ تشبیہہ اور استعاروں سے ایک نئی فضا تعمیر کرتے ہیں، آثرؔ اُس سے کہیں کم تر نظر نہیں آتے۔

جمیلؔ مظہری ایک اور بلند مقام شاعر ہیں، جن کے کلام میں بہت حد تک وہی فکری عناصر کارفرما ہیں جو کلامِ اِقبالؔ میں موجود ہیں۔ جمیلؔ نے اِقبالؔ کے فلسفہ عمل کو اپنی شاعری کا بنیادی محور بنالیا ہے اور اُن کی بہت سی نظمیں اِقبالؔ کے اُسی فلسفے سے متاثر ہیں جن میں پیام، شاعر کی تمنا، آدمِ نو کا ترانہ، میں اور تُو وغیرہ خاص طور پر ذِکر کے قابل ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، جمیلؔ مظہری کی اُس خصوصیت کی طرف اِشارہ

---

[۱] تفسیرِ اقبال ص ۱۷۹

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''جمیلؔ مظہری نے اِقبالؔ کے اُس تصوّر کو بہت احتیاط سے اپنایا ہے اور اُس میں وہی چیزیں لی ہیں جو اُن کے نزدیک معتبر اور صحت مند ہیں، یعنی حرکت وحیات اور اِنسانی عظمت کو عمومی طور پر اپنا زاویہ نگاہ بنایا ہے۔'' [۱]

اِقبالؔ اور جمیلؔ مظہری کے یہاں خدا کا تصوّر قدرِ مشترک ہے۔ اِقبالؔ کہتے ہیں کہ خدا کی شناخت خودی کی شناخت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اِقبالؔ اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں۔ جمیلؔ مظہری خدا سے متعلق مختلف تصوّرات اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں خدا کا اِسرائیلی تصوّر، خدا کا آریائی تصوّر اور خدا کا اِسلامی تصوّر موجود ہے۔ جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے تصوّرات تنگ نظری کے شکار نہیں ہیں۔ وہ تشکیک کے انداز میں ہر مسئلے پر غور کرتے ہیں۔ جمیلؔ مظہری حرکت وعمل کے شاعر ہیں اور یہ فلسفہ اِقبالؔ نے بھی دِیا ہے۔ اِقبالؔ کے یہاں زندگی مسلسل حرکت کا نام ہے۔ اُس میں تبدیلیاں رُونما ہوتی رہتی ہیں اور یہ اِرتقا پذیر ہے۔ علّامہ کے نزدیک خودی کا اِنحصار ندرتِ فکر وعمل پر ہے اور اُس ندرت کو سوزِ آرزو سے حرکت ملتی ہے۔ جمیلؔ بھی حرکت اور عمل کی اہمیت کے قایل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اِقبالؔ مردِ مومن کو اِخلاقی اَقدار کا قایل بناتے ہیں اور جمیلؔ انسان کو کسی بھی اخلاقی ضابطے سے وابستہ نہیں کرتے، بلکہ اُس کے عمل کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ اِقبالؔ اور جمیلؔ کے یہاں پیام، میں اور تُو، وغیرہ مشترکہ عنوانات کی نظمیں ہیں۔ اِقبالؔ کا ''پیام'' عشق کی عظمت کا دَرس دیتا ہے اور جمیلؔ ''پیام'' میں حرکت وحیات کے نظریئے کو پیش کرتے ہیں۔ اِسی طرح ''اِرتقا'' کے عنوان سے دونوں کے یہاں نظمیں ملتی ہیں جو دونوں زندگی کے فلسفے پر دال ہیں۔ اقبالؔ کے نزدیک زندگی شعلہ مزاج ہے اور جمیلؔ اُس کے اَثر سے اِنسان کو قدرت کا ایسا شاہکار ظاہر کرتے ہیں جو اپنی صلاحیتوں سے ترقی کرتا ہے۔

عورت کا تصوّر دونوں کے یہاں ملتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جمیلؔ نے اِقبالؔ کے تصوّرات کی روشنی میں اپنا تصوّر قایم کیا ہے۔ اِقبالؔ عورت سے عالم اور دانشور پیدا کرنے کی توقع کرتے ہیں اور جمیلؔ اُس کو صابر اور اِیثار وقربانی کا پیکر بناتے ہیں۔ عورت جمیلؔ کے نزدیک نہ روایتی ہے اور نہ جدّت

---

[۱] خلیل الرحمٰن اعظمی: فکر وفن ص ۱۹۸

پسند، نہ وہ اُسے ملکوتی تقدس بخشتے ہیں اور نہ مغربی تہذیب سے آلودہ کرتے ہیں۔

عشق اور عقل کے تصوّر کے بارے میں بھی دونوں کے یہاں مماثلت ملتی ہے اور جمیؔل کے یہاں جو اس تصوّر نے راہ پائی ہے وہ علاّمہ کے ہی تصورات کا عکس نظر آتا ہے۔ جمیؔل نے بھی اِقباؔل کے تتبع میں عقل پر عشق کو ترجیح دی ہے لیکن وہ عقل کو عشق کے مقابلے میں بالکل رَد نہیں کرتے۔ جمیؔل مظہری عشق کو عقل پر فوقیت تو دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ عقل کے کردار کی اہمیت بھی تسلیم کرتے ہیں۔

فنی سطح پر بھی جمیؔل مظہری، اِقباؔل سے گہرے طور پر متاثر ہیں۔ تشبیہہ، اِستعارے، علایم اور تراکیب کی حد تک دونوں میں جو حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے وہ اِسی اثر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ جمیؔل نے، اِس میں کوئی شک نہیں کہ فنی لحاظ سے بعض نئی روایات کا آغاز کیا اور مکمل طور سے قدیم باکمالوں کی تقلید نہیں کی۔ یہاں وہ علاّمہ اِقباؔل کے بہت نزدیک آجاتے ہیں اور بار بار ایسی تراکیب اِستعمال کرتے ہیں جو اِقباؔل کی متاعِ عزیز ہے۔ جمیؔل کے یہاں ذوقِ نگاہ، پیکرِ خاکی، ذوقِ نظر، درونِ خانہ، گردشِ ایام، نگاہِ شوق، صبحِ ازل جیسی تراکیب بار بار نظر آتی ہیں جو اِقباؔل سے مستعار لی گئی ہیں۔ اسی طرح دونوں کے یہاں سورج، آندھی، کرن، گھٹا، پربت، موتی جیسے ہلکے پھلکے الفاظ مفاہیم کے خزانے پیش کرتے ہیں۔ جمیؔل مظہری نے اِقباؔل کے کلام سے عشق، عقل، خدا، موت، زندگی، خودی، حُسن، بے خودی، یقین، حیات وغیرہ جیسے علایم مستعار لئے ہیں اور اپنے تصوّرات کو پیش کیا ہے۔

ماؔہر القادری بھی ایک اہم شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری کی خصوصیات میں پیکر تراشی اور علایم کی رنگارنگی کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی خوبیاں بھی شامل ہیں۔ ماؔہر نے اُردو کی جملہ شعری اَصناف میں طبع آزمائی کی اور خاص طور پر نظم کو اپنے اِظہار کا ذریعہ بنایا۔ ذِکر ہو چکا ہے کہ اِقباؔل نے اپنے معاصرین اور اپنے بعد آنے والے شاعروں کو متاثر کیا۔ ماؔہر القادری کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ ماؔہر القادری کو اِقباؔل کے اَثر میں لانے والا سب سے بڑا محرک اِقباؔل کا عشقِ رسولؐ تھا۔ وہ اِقباؔل کے اِسلامی تفکّر کے شیدائی بھی تھے اور اِقباؔل کی جرأت اور بے باکی، سامراج دُشمنی اور غریب نوازی سے بھی اکثر تحریک حاصل کرتے رہے۔ ماؔہر القادری نے اپنے کلام میں عمل اور حرکت کا درس دیا ہے اور اکثر مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے۔ ماؔہر نے اپنے اَشعار میں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن کو اِس بات کی ترغیب دی ہے کہ ذاتی مفاد، ملّی مفاد کے سامنے ہیچ ہیں۔ اِس لئے مِلّت کی

بھلائی کے لئے ذات کو فنا کرنا عین سعادت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب خیالات اِقبالؔ کے اَثرات کا نتیجہ ہیں۔ یہ کلامِ اِقبالؔ کا ہی اثر تھا کہ ماہرؔ القادری نے بھی اِسلام کے سرچشمے سے بصیرت پائی اور زندگی بھر اِسلامی عقاید اور اِسلامی تصوّرات کو شعر کے پیکر میں ڈھال کر پیش کرتے رہے۔ اِتنا ہی نہیں ماہرؔ القادری کی اکثر نظموں میں نظمِ اِقبال کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اِسلام اور اِسلامی معاشرت سے دِلچسپی لینے والے دُوسرے شاعر اسدؔ ملتانی ہیں جو اِسلام اور مسلمان سے عشق کرتے تھے اور قرآن اور حدیث پر جان دیتے تھے۔ اسدؔ ملتانی نے یہ ذہنی نہج اِقبالؔ کے سوزِ عشق سے حاصل کی تھی۔ اسدؔ ملتانی کو اگرچہ اپنے زمانے میں بڑے بڑے شعراُ کا ذہنی قُرب حاصل رہا اور حالیؔ کی سلاست اور سادگی نے اُنہیں اپنے قریب کھینچا لیکن اِقبالؔ کے تصوّرات نے اُن کے مسلک کی تہذیب کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے بار بار علاّمہ کو اپنا امام تصوّر کیا۔ اِقبالؔ سے سوزِ عشق کا پیغام لے کر اسدؔ ملتانی نے اس کو عام کرنے کی کوشش کی۔ ایسا کرتے ہوئے اُنہوں نے اِقبالؔ کے رنگ و آہنگ دونوں کو قبول کرلیا۔ علاّمہ کے ساتھ ذہنی رِشتہ اُستوار کرنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ دونوں کا مسلک اِسلام تھا۔ اسدؔ ملتانی کے کلام کا متعدد حصّہ اِقبالؔ کے ساتھ اُس ذہنی رِشتے کا ثبوت ہے۔ ایسے مواقع جہاں وہ رسولِ اکرمؐ کی برکتوں کا ذِکر کرتے ہیں، کلامِ اِقبالؔ کی طرح ایک سرمستی اور وارفتگی پیدا کرتا ہے۔ وہ خودنگری، خودی اور آئین سفاکیشی کو خودی کے مترادف سمجھتے ہیں جو کلامِ اِقبالؔ کا بھی حاصل ہے۔ فنی لحاظ سے اسدؔ ملتانی کے یہاں ایسے علایم، ایسے استعارے اور تشبیہات ملتی ہیں جو اِقبالؔ کو بہت مرغوبِ خاطر تھیں۔

ن م. راشدؔ کی شاعری میں بقول خلیل الرحمٰن اعظمی، اِقبالؔ کی شاعری، شخصیت کا تسلسُل اور اُس کی تشکیلِ نو ملتی ہے۔ اِقبالؔ پہلے شاعر تھے جنہوں نے اپنے آپ کو قومی اور ملکی شاعری سے علیحدہ کر کے آفاقیت کے نقوش اُجاگر کئے۔ وہ مشرق اور مغرب کی قدروں کے تصادم کو پیش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کی تہذیبوں میں واضح تضاد ہے۔ راشدؔ کے یہاں بھی یہ کرب ملتا ہے اور وہ مشرق کو مشرق کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِقبالؔ اور راشدؔ کے نظریات میں کوئی مماثلت نہیں ملتی لیکن دونوں کی شاعری کا پس منظر چونکہ ایک ہی عہد ہے، لہذا اُس عہد کی پیدا کی ہوئی بے اِطمینانی کے خلاف دونوں کا ردِ عمل ایک جیسا ہے۔ اقبالؔ نے جس طرح اپنے عہد کی سامراجی چالوں کو بے نقاب کیا تھا راشدؔ نے

بھی ایشیا اور افریقہ میں ہونے والی سامراجی تباہ کاریوں کا نقشہ کھینچ کر اُس کو بے نقاب کیا۔ سامراج کے اِستحصالی نظام کے خلاف یہ ردِعمل راشدؔ نے اِقبالؔ کے اَثرات سے ہی حاصل کیا تھا لیکن اپنے اپنے ردِعمل کو دونوں شعرأ مختلف لہجوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ راشدؔ اس حد تک اِقبالؔ سے مختلف ہیں کہ وہ محض مادی بنیادوں پر مغربی تہذیب کو رَد نہیں کرتے البتہ راشدؔ کا نظریہ محض سیاسی ہے۔ راشدؔ اور اِقبالؔ کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ راشدؔ خالص طور پر نظم کے شاعر ہیں اور اِقبالؔ نظم اور غزل دونوں کے وسیلے سے بات کرتے ہیں۔ ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ راشدؔ پابند نظم نہیں کہتے لیکن دونوں کے یہاں ایرانی اور عربی تلمیحات اور اَساطیر کا واضح استعمال ملتا ہے۔ راشدؔ نے یہ ہُنر اِقبالؔ کے اثرات سے ہی حاصل کیا ہے کہ وہ بھی تلمیحات اور اَساطیر کی پوری فضا تعمیر کرتے ہیں۔

راشدؔ، اِقبالؔ کے ہی اَثرات سے الفاظ کے اُسی ذخیرے سے کام لیتے ہیں جو پُرانے اور مستعمل الفاظ استعمال کرتے ہیں اور معنی کی نئی جہتیں پیدا کرتے ہیں یا حسبِ ضرورت نئی ترکیبیں اور اِستعارات گھڑ لیتے ہیں۔

احسانؔ دانش اُن شعرأ میں سے ہیں جو اگرچہ مزدوروں اور محنت کشوں کی ترجمانی ساری زندگی کرتے رہے لیکن اپنے خیالات کے اِظہار کرنے کا سلیقہ اُنہوں نے اِقبالؔ سے لیا۔ اِقبالؔ پوری مِلّت کو حرکت اور عمل کی بشارت دیتے ہیں اور احسانؔ یہی درس غریبوں اور مزدوروں کو دیتے ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی چکّی میں پسے ہوئے ہیں۔ احسانؔ نے یہ اَثر راست طور پر علاّمہ اقبالؔ سے لیا۔ اِسی کے ساتھ ساتھ اِقبالؔ کا سب سے اہم موضوع خودی اور خود شناسی ہے جسے اُنہوں نے وسیع تر تناظر میں پیش کیا ہے۔ احسانؔ کے موضوعات اگرچہ نچلے طبقے کے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں تاہم اُنہوں نے اپنی آتش نوائی سے یہ رُوح غریبوں اور مزدوروں میں پھونکی اور اُنہیں اپنے حقوق کو منوانے کے لئے جدوجہد پر اُکسایا۔ احسانؔ دانش اُن میں اپنی طاقت کو پہچاننے کی بشارت ہمیشہ دیتے رہے۔

اِقبالؔ نے سرمایہ دارانہ نظام کی ہمیشہ مخالفت کی اور اِس کے خلاف اپنی بیزاری کا اِظہار کیا۔ احسانؔ دانش نے اگرچہ ذاتی تجربے کی بنا پر سرمایہ دارانہ نظام کی چیرہ دستیوں کو سمجھ لیا تھا لیکن کلامِ اِقبالؔ کے مطالعے نے اُنہیں اپنے اِظہار کو مؤثر بنانے کا راستہ سمجھا دیا۔

خیال اور موضوعات کی سطح پر بھی احسانؔ نے علاّمہ کا شعری طرز پیش قبول کیا اور اس کا سب

سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ اُنہوں نے اِقبالؔ ہی کی طرح شاعر، ایک آرزو، نماز اور دُنیا جیسی کئی نظمیں لکھیں اور ''شامِ گورستان''، ''میں اور تو''، ''ایمان'' اور ''ترانہ جہاد'' جیسی نظموں میں واضح طور پر اِقبالؔ کی تقلید کی۔

سردارؔ جعفری، اِقبالؔ کے معترض بھی ہیں اور مداح بھی۔ سردارؔ نے خود اِعتراف کیا ہے کہ اِقبالؔ کی نظم ''خضرِ راہ'' نے سب سے پہلے اُنہیں اِس قدر متاثر کیا کہ اُنہوں نے اپنے خوابوں کی دُنیا تعمیر کرنا شروع کردی۔ بعد کے برسوں میں کلامِ اِقبالؔ کے اَثرات اُن کے یہاں برابر نظر آتے ہیں۔ سردارؔ اور اِقبالؔ کے راستے جُدا جُدا ہیں۔ سردارؔ مارکسی فلسفے کو اپنا جُزوِ ایمان سمجھتے ہیں اور اِقبالؔ نے اِسلام سے روشنی حاصل کی ہے، لیکن حیات و کائینات کے مسایل، وطنی اور قومی تصوّرات، سامراج دُشمنی اور اس طرح کے دُوسرے تصوّرات اُنہوں نے کلامِ اقبالؔ سے لیے ہیں۔ سردارؔ کی شاعری میں جو ایک نیا آہنگ اور جوش و خروش ملتا ہے، وہ اِقبالؔ ہی کے اَثرات کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کہتے ہیں کہ ''اِقبالؔ کا آہنگ ہے آہنگِ بغاوت۔''

سردارؔ جعفری کے کلام میں اس دور کے اِنسان کا کرب نظر آتا ہے۔ وہ جنگ و جدل اور فساد و اِنتشار کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ آواز اِقبالؔ کی بھی ہے اس لئے دونوں کا لہجہ ایک دُوسرے سے مماثل نظر آتا ہے۔ سردارؔ کے کلام کے ایک بڑے حصّے میں کلاسیکی شاعری کا رچاؤ ملتا ہے اور یہ خصوصیت کافی حد تک اِقبالؔ کے اَثرات کا نتیجہ ہے۔

اِقبالؔ نے ''ساقی نامہ'' جیسی مثنوی لکھی اور اِس صنف میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ سردارؔ اُس نظم سے بہت متاثر رہے چنانچہ اُنہوں نے بھی ''جمہور'' کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی۔ فارم، ہئیت اور تکنیک کے اعتبار سے یہ مثنوی ''ساقی نامہ'' سے ملتی جلتی ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فنی اعتبار سے بھی وہ اِقبالؔ کے قریب ہیں۔

سردارؔ جعفری کی غزلوں میں شکستِ شوق، تکمیلِ آرزُو، خیالِ یار، داغِ آرزُو، آدمِ خاکی، خونِ جگر، کوچہ قاتل، صبحِ بہاراں، شہرِ نگار، باغِ جہاں، عروسِ قمر اور اس قبیل کی بیسیوں تراکیب اِستعمال ہوئی ہیں جو اگرچہ سب کی سب کلامِ اقبالؔ سے مستعار نہیں ہیں، لیکن اُن میں سے بیشتر ایسی ہیں جن میں اقبالؔ کے آہنگ اور اُن کے انداز کا اَثر ملتا ہے۔

دورِ حاضر کے اقبالؔ کے شیدائیوں میں جگن ناتھ آزاد ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اِس کا ثبوت اقبالؔ سے متعلق اُن کی مختلف کتابیں ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اقبالؔ اور اِقبالیات کے بارے میں جس قدر تن دہی اور لگن سے اُنہوں نے کام کیا ہے، وہ اُن کا ہی حصّہ ہے۔ آزاد ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ کلامِ اقبالؔ سے عشق ہونے کے سبب سے اُن سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ آزاد نے فکری اور فنی سطح پر اِقبالؔ سے اِستفادہ کیا۔ آزاد نے اقبالؔ کے آفاقی تصوّرات کو اپنے کلام میں رچالیا ہے۔

آزاد کے بیشتر موضوعات اقبالؔ سے مماثلت رکھتے ہیں چنانچہ اِس سلسلے میں اُن کا تصوّرِ عشق قابلِ ذکر ہے۔ یہاں وہ اقبال ہی کی طرح عقل کو عشق کے تابع بناتے ہیں۔ اِسی طرح آزاد کے تصوّرِ خودی، عمل اور حرکت، تصوّرِ حیات اور کائنات، سامراج دُشمنی، وطنی شاعری اِن سب موضوعات پر کلامِ اقبالؔ کی چھاپ ہے۔ اِس لئے خواجہ غلام السیدین کا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ آزاد نے اقبالؔ کے کلام سے اندازِ فکر اور اندازِ بیان کی آب وتاب لی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے یہاں بھی فطرت کے مناظر کے صدرنگ جلوے نظر آتے ہیں اور اُن کا موئے قلم اقبالؔ کی تصویری نظموں کا عکس کھینچتا ہوا نظر آتا ہے۔

زبان وبیان کے اعتبار سے بھی اقبالؔ کے اثرات کلامِ آزاد میں محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ ایسے علایم اور تراکیب مثلاً طائر گفتار، انوارِ قمر، سوزِ درون، عکسِ خورشید، رازِ ازل، وغیرہ ایسی ترکیبیں ہیں جو اقبالؔ کے کلام میں بھی ملتی ہیں اور جن کو آزاد نے ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد اپنی اِنفرادیت رکھتے ہوئے بھی اُس اَثر سے اپنے آپ کو الگ نہیں کرسکتے ہیں جو اقبالؔ کی دین ہے۔

شورشؔ، اقبالؔ کی نسل کے بعد کے شاعر ہیں اور اپنے معاصرین کی طرح اُنہوں نے بھی کلامِ اقبالؔ کا مطالعہ کیا اور اُس سے فیض حاصل کیا ہے۔ دونوں کا منبعِ فیض اِسلام اور اِسلامیات ہے۔ اس لئے دونوں کا ردِعمل ایک دُوسرے سے مماثل ہے۔ شورشؔ کاشمیری، اقبالؔ کے علم وفضل اور اِسلامی تفکّر کے بڑے قایل تھے۔ اِس لئے اُنہوں نے اپنے تصوّرات کی تشکیل میں اقبالؔ کی فکر اور اُن کے نظریات سے اثر لے لیا۔ خاص طور پر عمل اور حرکت کے بارے میں اقبالؔ نے جس طرح کا درس مسلمانوں کو دیا ہے اُسے شورشؔ نے شعوری طور پر اپنے کلام میں لے لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عملی زندگی میں اقبالؔ کی بے عملی پر اعتراض کرتے رہے ہیں۔ مجموعی طور پر شورشؔ کے یہاں اقبالؔ کے اثرات اُس طرح نہیں

دیکھے جاسکتے جس طرح دُوسرے شعرأ کے یہاں ملتے ہیں۔ اِس لئے کہ سیاست کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ ہونے کے سبب شورش کے یہاں خطابت کا احساس زیادہ ہوتا ہے جبکہ اقبالؔ کے یہاں خطابت بہت کم ملتی ہے۔

متذکرہ بالا صفحات میں اِقبالؔ کے معاصرین اور اِقبالؔ کے بعد آنے والی نئی نسل کے بعض نمایندہ شعرأ کا ذِکر ہوا ہے اور اُن اَثرات کا بھی ذِکر کیا جاچکا ہے جو شعوری طور پر اُن شعرأ نے اقبالؔ سے قبول کیئے۔ مدِ نظر رہے کہ اقبالؔ کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے شعرأ یا اُن کے بعد آنے والے بعض شعرأ اُردو ادب میں ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور اُن کا ایک مقام ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اُن میں بعض لوگ اپنے علیحدہ رنگ سے پہچانے جاسکتے ہیں اور فنی حیثیت سے بھی اُنہوں نے اپنا لوہا منوایا ہے، لیکن اِس کے باوجود وہ بعض تصوّرات کے لئے اقبالؔ کے مرہونِ منت رہے ہیں اور اُن سے مستقل روشنی حاصل کرکے اپنی تخلیقات کو منوّر کرتے رہے ہیں۔ فنی لحاظ سے بھی اقبالؔ کے انداز، اُن کے آہنگ اور زبان کے برتاؤ کے معاملے میں بھی اُن سے اِستفادہ کرتے رہے اور یہ منصب اقبالؔ جیسے شاعر کے شایانِ شان تھا۔

جمہوری فکر اور ٹیگور کی شاعری

رابندر ناتھ ٹیگور اُن چند عظیم فنکاروں میں سے تھے جنہوں نے اپنی تخلیقی قوّت سے شعر و اَدب میں اِنقلاب پیدا کیا۔ ٹیگور شاعر بھی تھے اور موسیقی کے دِلدادہ بھی، اُنہوں نے ناول بھی لکھے اور ڈراما نگاری میں بھی اپنا نام پیدا کیا۔ ٹیگور اداکار بھی تھے اور ماہرِ تعلیم ہونے کے علاوہ ایک مفکر بھی تھے۔ اُن کی فکر کی جڑیں اسی سرزمین میں پیوست تھیں۔ اُپنشدوں کے گہرے مطالعے نے اُن کے ذہن کو ایک بحرِ بیکراں بنا دیا تھا اور ساتھ ہی اُن کی تحریروں پر داخلیت کا رنگ چڑھ چکا تھا۔ یہ ٹیگور کے قلم کا ہی اعجاز ہے کہ اُن کا فن مغربی اَدب کے بہترین فن پاروں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔

ٹیگور ۱۸۶۱ء میں بنگال میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان تہذیب و تمدّن کا گہوارہ تھا۔ یہ خاندان قدامت پرست نہیں تھا بلکہ جدید علوم سے رُوشناس تھا۔ اس خاندان کے دیگر افراد بھی شعر و موسیقی سے دِلچسپی رکھتے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی فنِ موسیقی کے اُستاد تھے اور اُن کی بہن بنگال کی معروف ادیبہ تصوّر کی جاتی ہے۔ ٹیگور نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے چاروں طرف شعر و اَدب کا ماحول دیکھا، خود بھی بچپن سے ہی اس ماحول سے دِلچسپی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ جب وہ صرف آٹھ برس کے تھے تو اپنی پہلی نظم لکھی۔ یہ نظم پسند کی گئی اور اس طرح سے اُن کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

رابندر ناتھ ٹیگور شروع سے ہی وطنی اور قومی بیداری کے خواہاں تھے۔ اُنہوں نے جو زمانہ دیکھا وہ ہندوستان میں سیاسی اُتھل پُتھل کا زمانہ تھا۔ وطن کی آزادی کی خاطر بہت ساری سیاسی تحریکات کا آغاز

ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا اندوہناک واقعہ ہندوستان کی تاریخ میں کبھی نہ فراموش ہونے والا واقعہ ہے۔ کانگریس کا قیام، بنگال کی تقسیم، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، خلافت تحریک، سوراج کا نعرہ ——— یہ تمام کبھی نہ فراموش ہونے والے واقعات ہیں۔ ٹیگور بھی ان واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اُن کی شاعری ایک نیا رُخ اختیار کرنے لگی۔

ٹیگور شروع شروع میں قدرتی مناظر کو اپنی شاعری میں بڑے مؤثر انداز میں بیان کرنے لگے تھے لیکن جب اُن کا شعور بالغ ہوا اور اُنہیں وطن کے تئیں اپنے فرائض کا احساس ہوا تو اُن کی شاعری ایک نئے دور میں داخل ہوئی اور اس میں قومی درد اُبھرنے لگا۔ نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعے سے بلکہ عملی طور پر بھی وہ تحریکِ آزادی میں شامل ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں جب بنگال تقسیم ہوا تو اس تقسیم کو ختم کرنے کے لئے ٹیگور نے اپنا تعاون پیش کیا۔ اس دور میں اُنہوں نے بے شمار گیت اور نظمیں تخلیق کر کے قوم کو بیدار کیا۔ اس موقعہ پر ٹیگور نے اپنے جوشیلی تقاریر سے انگریزوں کو للکارا۔ اسی دور میں بنگال گورنمنٹ نے ''بندے ماترم'' غیر قانونی قرار دیا۔ اس پر وہ زبردست بد دِل ہوئے اور صدائے احتجاج بلند کیا۔

ٹیگور صحیح معنوں میں قوم کے رہنما اور وطن کے حقیقی دوست تھے۔ اُنہوں نے ایک بار لکھا تھا:-

''ہم لوگ اگر مُلک کی قومی تحریک کو واقعی کامیاب بنانا چاہتے ہیں
تو سب سے پہلے ہم کو نچلے طبقے کے لوگوں میں خودداری کا احساس پیدا
کرنا ہوگا اور ان کو صحیح معنوں میں اِنسان بنانا ہوگا۔''

رابندر ناتھ ٹیگور جمہوری قدروں کے بے حد دِلدادہ تھے۔ جب کہیں یہ قدریں پامال ہوتی ہوئی دِکھائی دیتی تھیں تو اُنہیں ٹھیس پہنچتی تھی۔ وہ ایک سچے اِنسان تھے اور اِنسانیت کو ہی اپنا مذہب تصور کرتے تھے۔ ٹیگور کی وطن دوستی میں کسی تنگ نظری، جارحانہ جذبے یا غیر ملکیوں کے خلاف نفرت کو دخل نہیں تھا، بلکہ اُن کا پیغام آفاق گیر تھا۔ اس پیغام کو عام کرنے کے لئے اُنہوں نے اپنی شاعری کا بھرپور استعمال کیا۔ چنانچہ اپنی ایک نظم میں وہ عوام کو غفلت کی نیند سے بیدار کرتے ہیں اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجئے:-

چلو آگے چلو آگے چلو آگے مرے بھائی

سفر میں زندگی کے قافلوں سے پیچھے رہ جانا
جو سچ پوچھو تو جیتے جی ہے گویا موت کا آنا
فقط جی جی کے مرجانا نہیں مقصد ہے جینے کا
ہے جینا نام جامِ آرزو بھر بھر کے پینے کا
چلو آگے چلو آگے چلو آگے مرے بھائی........!

ٹیگور عوام کو خوشحال دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ قوم کی بھلائی کے لئے تن دہی سے کام کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں پہلی مرتبہ گاندھی جی اور ٹیگور کی ملاقات ہوئی۔ گاندھی جی کی حُب الوطنی اور قوم پرستی دیکھ کر ٹیگور بڑے متاثر ہوئے اور اُنہیں ''مہاتما'' کا خطاب دِیا۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی سیاست نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ رولٹ بل کی منظوری کے خلاف مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اِسی دوران پنجاب میں کئی حادثات پیش آئے اور جنرل ڈائر نے قتلِ عام کا بازار گرم کر کے جلیانوالا باغ کو ہندوستانیوں کے خون سے رنگ لیا۔ یہ خبر سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی ۔ ٹیگور نے انگریزوں کے اس وحشیانہ اور بے رحمانہ عمل کے خلاف اِحتجاج کرتے ہوئے وائسرائے ہند لارڈ چمسفورڈ کو ایک سخت خط لکھا اور ۱۹۱۵ء میں برطانوی سرکار نے اُنہیں جو 'نائٹ ہڈ'' کا خطاب دیا تھا' ٹیگور نے اس خطاب کو واپس کر دیا۔

ٹیگور نے اپنی شاعری کے توسط سے اُن آرزؤں اور جذبوں کو زبان دی جو کروڑوں ہندوستانیوں کے دِلوں میں مچل رہے تھے۔ وہ اُن غیور ہندوستانیوں میں سے تھے جو دوٹوک بات کہنے پر یقین رکھتے تھے۔ ٹیگور غفلت کی نیند میں سونے والوں کے خلاف تھے۔ وہ بیدار اور نڈر اِنسان کو دیکھنا چاہتے تھے اور خود بھی اُن کے ساتھ چلنا چاہتے تھے۔ اِسی لئے وہ بار بار کہتے تھے:۔

''میری مکتی دُنیا کو ترک کر دینے میں نہیں ہوگی۔ میں اِنسانوں کے درمیان رہنا چاہتا ہوں۔''

اِس نظریئے کو وہ اپنی ایک نظم'' دُعائے ہند ''میں بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں:۔

تو نے ہمیں زندہ رہنے کے لئے پیدا کیا
ہم اس عزت کو پوری قوت سے برقرار رکھیں گے

کیونکہ ہماری خوشنودی اور شان اسی میں ہے کہ ہم زندہ رہیں
اِس لئے تیرے نام پر ہم اس قوت کا مقابلہ کریں گے
جو ہماری رُوح پر قبضہ کرے

ٹیگور کی شاعری میں جمہوری فکر کا ایک عنصر یہ بھی ہے کہ وہ حقیقت کو فلسفیانہ تفکّر سے الگ کر کے ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ یہ ایک نئے تجربے کی صُورت میں سامنے آجاتا ہے۔ زندگی کے متعلق ٹیگور کا فلسفہ بھی جُداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ وہ زندگی کو زبردست اہمیت دیتے ہیں۔ بشرطیکہ زندگی اعلیٰ مقاصد کے لئے ہو، محض مرنے یا زندہ رہنے کے لئے نہ ہو۔ وہ اپنے اس نظریئے کو ''گیتا نجلی'' میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''زِندگی سزا نہیں بلکہ ایک برکت اور عطیہ ہے۔
زِندگی میں دیکھنے اور سُننے کی قابلِ قدر اور مسرّت بخش صلاحیتیں موجود ہیں۔ زندگی کے معنی ہیں کہ ہم اپنے وجود کے طاقتوں کے استعمال سے سچائی، نیکی اور خوبصورتی کو ہر طرف پھیلائیں۔ ہمارا جینا حقیقت کے اِظہار کے لئے ہو، کسی شخصی مقصد کے لئے نہیں۔''

ٹیگور کے مطابق خوشحال زندگی گذارنے اور اس میں رونق لانے اور خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے اِنسان کو دِل لگا کر کام کرنا چاہئے۔ اِنسان چاہے کسی بھی مذہب اور دھرم یا عقیدے سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو، محنت سے ہی اپنی زندگی خوشگوار بنا سکتا ہے اور خدا کو اپنے نزدیک پا سکتا ہے۔ اپنی ایک نظم میں عالمگیر اِنسانیت کے لئے پیغام دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

خدا وہاں ہے جہاں کسان سنگلاخ پتھریلی زمین کھود رہا ہے
اور جہاں سڑک بنانے والا پتھروں کو توڑ رہا ہے
وہ دھوپ اور بارش میں تیرے ساتھ ہے
اور اس کے کپڑے
گردوغبار میں اَٹے ہوئے ہیں

ٹیگور کی بے شمار تحریروں سے اُن کی حُب الوطنی اور عوام پروری کا جذبہ آنکھوں کے سامنے آجاتا

ہے۔ اُن کی شاعری سے ایسی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے جمہوری فکر کی نشاندہی ہوتی ہے۔
''آزاد مُلک''میں اُنہوں نے جو خواب دیکھا تھا۔ وہ ہر فرد اور ہر شہری کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں:۔

جہاں دِل کو خوف نہیں ہے اور سر اُونچا ہے
جہاں علم مُفت دیا جاتا ہے
جہاں دُنیا کو
تنگ خانگی دیواروں کے ذریعے ٹکڑے ٹکڑے
نہیں کیا گیا
جہاں سچائی کی گہرائی سے اَلفاظ نکلتے ہیں
جہاں اَنتھک کوششیں کمال کی طرف
اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہیں
جہاں عقل کی صاف ندی
اپنی مردہ عادت کی ریت کے بھیانک
صحرا میں
اپنا راستہ نہیں کھو بیٹھتی

ٹیگور عقیدے کے اعتبار سے برہمو سماج سے وابستہ تھے۔ برہمو سماج سے وابستگی نے اُن کو قدامت پسندی کے حِصار سے نکال کر ترقی پسند اَقدار کے قریب تر کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُن کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اُن کے لافانی نغموں میں اپنی زمین اور اپنے کلچر کی بُو باس ہے۔ اُن کی تحریریں اِس بات کی غماز ہیں کہ وہ اِنسانیت کے ساتھ ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ وہ ہر اِنسان میں لافانی حقیقت کا جلوہ دیکھتے تھے۔ اُن کی نظر میں رُوحانیت کے وارث وہ لوگ ہیں جو خون پسینہ ایک کر کے جیتے ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے ساتھ گہری محبت کے باوصف وہ مہرشی آفاقیت کے طرف دار تھے اور عالمی بھائی چارے کے لئے کوشاں تھے۔ وِشوا بھارتی یونیورسٹی کا قیام اُن کے آفاقی نظریئے کا ایک اور پہلو ہے اور سری نکیتن ہندوستان کے دیہات کو اُوپر اُٹھانے کی پہلی جہت۔

ٹیگور مادرِ ہندوستان کے وہ عظیم فرزند تھے جنہوں نے بیسویں صدی کے اُفق پر فکر و نظر، علم و اَدب،

شعر و نغمہ اور رنگ و آہنگ کا آفتاب منوّر کر کے اِنسانی زندگی کے نہ جانے کتنے تاریک گوشے روشن کئے۔ ٹیگور کی نظمیں اور گیت "جن گن من" ہو یا "دیدی"، "سندھیا سنگیت" ہو یا "سونے کی ناؤ"، "پرانا نوکر" ہو یا "قاتل کی رات" ان سب نظموں میں ہندوستانی رُوح تھرکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی رگ رگ میں وطنیت اور قومی درد کے ساتھ ساتھ جمہوری فکر کی بنیادیں موجود ہیں۔ ٹیگور کی شاعری میں غریب اور مفلس عوام کے تئیں ہمدردانہ جذبہ ملتا ہے۔ یہاں کے کسان، باغات، پہاڑ اور دریا وغیرہ کے ذِکر سے اُن کی شاعری خالی نہیں۔ وہ ہر جگہ اپنے وطن کے تئیں سچے جذبے کا اِظہار کرتے ہیں اور یہی کیا کم اہم ہے۔

کشمیر کا پریم چند

— پریم ناتھ پردیسی

کشمیر صدیوں سے اپنے حسین لالہ زاروں، شاداب وادیوں اور مہکتی ہوئی فضاؤں کے لئے مشہور ہے۔ یہاں قدرتی نظاروں کے ساتھ ساتھ صنعت کاروں، عالموں، فن کاروں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور اس میں ایسے گہر پارے پیدا کئے کہ ایک دُنیا حیران ہوگئی۔ چنانچہ اُردو شعر و ادب میں ایسی لازوال تخلیقات ہم لوگوں نے پیش کیں کہ ہند کے بڑے بڑے لکھنے والے بھی دیکھتے رہ گئے۔ انہی فن کاروں میں سے ایک فنکار پریم ناتھ پردیسی ہیں۔

پردیسی کا اصلی نام پریم ناتھ سادھو تھا۔ وہ حبہ کدل کے ایک محلے زنیہ دار محلہ کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم پاکر جب وہ کالج چلے گئے تو افلاس کی وجہ سے جلد ہی تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا۔ اس کے بعد محکمہ کسٹم و اکسائز میں ایک معمولی عہدے پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء تک سولہ سال کی ملازمت کے بعد اُنہیں صرف ۸۰ روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ریڈیو کشمیر وجود میں آیا تو اُن کی خدمات کو وہیں پر پروگرام اسسٹنٹ کے عہدے پر منتقل کیا گیا۔ یہاں اُن کو کافی کام کرنا پڑا۔ وہ معدے کے دائمی مریض تھے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں اُن کا آپریشن کیا گیا اور اس سے وہ جان بحق ہوگئے۔

پردیسی نے ابتداً میں اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا۔ اس زمانے میں وہ رونق تخلص کرتے

تھے لیکن یہ میدان اُن کو راس نہ آیا، چنانچہ اُنھوں نے نثر کی طرف رجوع کیا۔ وہ غالباً کشمیر کے پہلے افسانہ نگار تھے۔ اُنھوں نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا تو اُس زمانے میں پریم چند کے رُومانی افسانوں کی دھوم تھی اور ٹیگور کی شاعرانہ نثر کافی مشہور تھی۔ رونق نے اس اَثر کو قبول کر لیا اور ہلکے پھلکے افسانہ لکھے۔ اِن میں ہر افسانہ نگار کی طرح رومانیت کا اَثر غالب تھا۔

۱۹۳۶ء سے کچھ پہلے جب "انگارے" شائع ہوئی تو اُنھوں نے محسوس کیا کہ اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، سب بے کار ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے مطالعے کو وسیع کرنا شروع کیا اور غیر مُلکی افسانہ نگاروں کے علاوہ نئے افسانہ نگاروں کی چیزیں بھی پڑھنا شروع کر دیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اور اُردو ادب پر اس کا اثر گہرا ہوا۔ پردیسی جو اَب رونق کے بجائے پردیسی کے نام سے لکھنے لگے تھے، اس ریلے میں آ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر ایک اس نئی تحریک کے اثر سے بھوک، افلاس اور سماجی پستی کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا اور پھر رومانیت اور تصوّر پرستی کی مخالفت کا آغاز ہوا تھا۔ اُس زمانے تک پردیسی کے افسانوں میں خارجی حقیقت اور افادیت کی کمی تھی اور تخیل اور داخلی جذبات زیادہ تھے۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے ایک بار مشہور افسانہ نگار خاتون صدیقہ بیگم سیوہاروی کے نام ایک خط میں یوں لکھا ہے:-

> "۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک جو کچھ میں نے لکھا اُس پر میں فخر نہیں کر سکتا۔ اس وقت تک مُجھے یہ احساس نہیں تھا کہ افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے مُجھے اپنے عزیز وطن سے کیا فرائض ہیں۔ اُس وطن کے جس کے ۶۰ رلاکھ باشندے پورے چار سو سال سے غلام در غلام چلے آ رہے ہیں۔ جن کی جڑیں اَفلاس اور لوٹ کھسوٹ سے کھوکھلی ہو چکی ہیں۔"

چنانچہ ترقی پسند مصنفین کی تحریریں پڑھنے سے اُن میں ایک نیا احساس پیدا ہوا۔ ان مصنفین کی آواز نئی تھی۔ ان کے ہر لفظ سے غصہ، رنج اور بغاوت ٹپکتی تھی۔ اس احساس نے سب لکھنے والوں کو بیدار کیا تھا۔ پریم ناتھ پردیسی بھی خوابِ غفلت سے بیدار ہوئے۔

۱۹۴۶ء میں نیشنل کانفرنس کے زیرِ قیادت "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کا

مقصد ڈوگرہ شاہی سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ یہ تحریک دراصل اُس ہندوستان گیر تحریک کا ایک حِصّہ تھی جس کی قیادت گاندھی، نہرو اور ابوالکلام آزاد جیسے لیڈر کر رہے تھے اور جن کا مقصد ہندوستان سے انگریز کو بھگا کر ہندوستان کو آزاد کرنا تھا۔

نیشنل کانفرنس کی قیادت میں بھی کشمیر کے عوام متحرک و متحد ہونے لگے، پردیسی نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا۔ چنانچہ اُس زمانے میں اُنہوں نے ذمہ دار نظام حکومت سے قبل اور اس کے بعد بالک رام بارؔی کے نام سے کچھ افسانے لکھے۔ اس میں اُنہوں نے شخصی حکمرانی، نوکر شاہی کے مظالم اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف عوام کے احساساتِ نفرت اور غصّے کی ترجمانی کی۔ ۱۹۴۱ء میں پردیسی نے دوسرے کشمیری ادیبوں کے ساتھ مل کر کشمیر میں ترقی پسند تحریک کی بُنیاد ڈالی، جس کی بعد میں وہ خود آبیاری کرتے رہے اور آج کے بڑے بڑے لکھنے والے اُسی تحریک کی پیداوار ہیں۔

پردیسی کے افسانوں کے موضوعات توہم پرستی، نوکر شاہی، رشوت خوری، عوام کی بدحالی، مذہبی تفریق اور فرسودہ سماجی بندشیں تھیں۔ اِسی طرح اُنہوں نے اپنے افسانوں میں اِنسان دوستی، زندگی، فن اور امن سے محبت کی داستان بھی سموئی۔ پردیسی کشمیری عوام کے صحیح نمائندے تھے۔ اُن کی اُنگلیاں ہمیشہ عوام کی نبضوں پر رہتی تھیں اور وہ اُن کے مسائل کو پیش کیا کرتے۔ اُن کا خیال تھا کہ کشمیر کا ہر بدنصیب باشندہ ایک افسانہ ہے جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ یہ ضرور ہے کہ ہند کے چند مشہور افسانہ نگاروں نے یہاں کی کہانیاں ضرور لکھیں لیکن اُن کا اندازِ نظر غلط تھا۔ اُنہوں نے ہمیشہ قدرتی اور خوبصورت مناظر سے متاثر ہو کر تخیلی اور رُومانی خاکے کھینچے جن کا یہاں کی اصلی زندگی اور خارجی حقیقتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ پردیسی کی نظر میں یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ غلامی، افلاس اور شخصی حکومت تھی۔ لیکن باہر کے افسانہ نگاروں نے محض یہاں کی جنسیت کو دیکھا لیکن جہنم کی آگ میں دہکتی ہوئی زندگیوں کو نظر انداز کیا۔

پردیسی اِبتدا میں مقامی اخبارات میں لِکھا کرتے تھے۔ اس زمانے کی نمائندہ کہانیاں اُن کے پہلے افسانوی مجموعہ "شام وسحر" میں چھپ چکی ہیں لیکن بعد میں وہ ہندوستان کے بڑے بڑے ادبی رسالوں میں چھپتے رہے اور اُن کا نام اُردو کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگا۔ اس دور کے مجموعے "دُنیا ہماری" اور "بہتے چراغ" "بُجھتے چراغ" اُن کے شعور کی پختگی اور اُن کی سماجی بصیرت

پر دلالت کرتا ہے۔اس کے علاوہ اُن کے بہت سے مجموعے ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں اور اُن کو شائع نہیں کیا گیا ہے۔

پردیسی کی کہانیاں بُنیادی طور پر کشمیر کی کہانیاں ہیں اور اُن لوگوں کی کہانیاں ہیں جو کشمیر کی گلیوں، کوچوں اور گندی بستیوں میں رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یہاں کے غریب عوامی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی محنت سے صدیوں کے افلاس کا مقابلہ کرتے ہیں۔اُن کے کردار ہمارے جانے پہچانے کردار ہیں۔اُن میں مسجدوں کے مُلاّ بھی ہیں، مندروں کے پنڈے بھی، اپنے خونِ جگر سے سینچنے والے پیپر ماشی اور لکڑی پر کھدائی کرنے والے فنکار بھی اور سوزن کاری کرنے والے بھی۔لداخ کے رہنے والے بھی ہیں، کشمیر کے بھی اور جموں کے بھی۔حقیقت تو یہ ہے کہ پردیسی ہمارے وہ افسانہ نگار تھے جنہوں نے صحیح طور پر ہماری معاشی اور سماجی زندگی کی عکاسی کی اور جنہوں نے کشمیر میں عام طور سے اُردو نثر اور خاص کر افسانہ نگاری کی راہیں استوار کرلیں۔ہمیں اپنے اس عظیم افسانہ نگار پر فخر ہونا چاہیئے۔

''جوش ملیح آبادی: تنقیدی جائزہ''

پر ایک نظر

ڈاکٹر خلیق انجم نہ صرف ایک محقق اور نقاد کے طور پر ہی برصغیر ہندو پاک کے اُردو اَدبی حلقوں میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں بلکہ وہ ایک صحافی اور مرتب کے طور پر بھی اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ کلاسیکی اور نئے تخلیق کاروں پر اُن کا کام سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی مثال اُن کی گونا گوں موضوعات پر لکھی اور مرتب کی گئی تصانیف سے ملتی ہے۔

''جوش ملیح آبادی (تنقیدی جائزہ)'' شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی پر اُن کی مرتب کی گئی ایک عمدہ اور جاذبِ نظر تصنیف ہے، جو جوشؔ کے بعض اہم فکری اور فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔ اِس کے مطالعے سے جوشؔ ملیح آبادی کی پُرکشش شخصیت ایک نئے زاویئے سے سامنے آتی ہے۔ یہ تصنیف نہ صرف جوشؔ کے فکر و فن کی خوبیوں کو اُجاگر کرتی ہے بلکہ اُن کی خامیوں اور کوتاہیوں کو بھی زیرِ بحث لانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

''جوشؔ ملیح آبادی (تنقیدی جائزہ)'' میں چودہ تحقیقی و تنقیدی مقالات شامل ہیں جن کے لکھنے والے اُردو کے قدرِ اوّل کے ادیب اور نقادانِ فن ہیں۔ جوشؔ پر لکھے گئے تمام مقالات نہایت ہی محنت سے لکھے گئے ہیں اور ڈاکٹر خلیق انجم نے بڑی ذہانت اور دیانت داری سے اُن مقالات کا اِنتخاب کچھ اِس طرح سے کیا ہے کہ کتاب میں شامل تحریروں میں خود بہ خود تسلسل پیدا ہو گیا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے جوشؔ کی ولادت سے لے کر اُن کی رحلت تک کے بعض اہم واقعات سلسلہ وار آنکھوں کے

سامنے آجاتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ اُن کی تخلیقات اور تصانیف کے بارے میں بھی بھرپور جانکاری ملتی ہے۔ ''جوشؔ ملیح آبادی (تنقیدی جائزہ)'' سے جوشؔ کی نجی زندگی کے بارے میں بھی تفصیلات فراہم ہوتی ہیں۔ اِس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب جوشؔ کا ایک بھرپور مطالعہ پیش کرتی ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ میں قارئین کی دِلچسپی کے لئے کتاب کے مندرجات کو چار ذیلی عنوانات میں تقسیم کرتا ہوں:۔

(۱) جوشؔ کی شخصیت

(۲) جوشؔ کی شاعری

(۳) جوشؔ کی نثر نگاری

(۴) متفرقات

جوشؔ کی شخصیت کے ذیل میں جو مقالات آتے ہیں۔ اُن میں ''حرفِ آغاز'' اور ''حضرت جوشؔ کی شخصیت اُن کے اشعار کے آئینے میں'' کے نام لئے جاسکتے ہیں بلکہ پروفیسر مسعود حسین خان کے مقالے کا نصف حصہ بھی شخصیت کے ذیل میں آتا ہے۔ یہ مقالات جوشؔ کے تمام شخصی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ''حرف آغاز'' میں ڈاکٹر خلیق انجم نے جوشؔ ملیح آبادی کی شخصیت اور شاعری پر نہ صرف بھرپور نظر ڈالی ہے بلکہ جوشؔ کے بچپن کے حالات، اُن کا مذہب، اُن کی ملازمت، پنڈت نہرو کے ساتھ اُن کے تعلقات، ملیح آباد اور حیدرآباد میں جوشؔ کا قیام، اُن کی ہجرتِ پاکستان وغیرہ جیسے نکات پر بھی مدلل بحث کی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے جنگِ آزادی میں جوشؔ کا حصہ، اُن کی رُومانی اور اِنقلابی شاعری، اُن کی وطن پرستی اور اِنسان دوستی جیسے موضوعات پر بھی اپنے خیالات کا اِظہار کیا ہے۔ اِس طرح سے موصوف کی یہ تحریر جوشؔ کی شخصیت اور فن پر ایک مکمل اور مربوط دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُنہوں نے بعض ایسے گوشے سامنے لائے ہیں جن پر جوشؔ پر تحقیق کرنے والوں نے بہت کم توجہ دی ہے۔ پندرہ صفحات پر مشتمل یہ ایک پُر مغز تحریر ہے اور جوشؔ کے بعض اہم فکری اور فنی گوشوں کی بازیافت کرتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر خلیق انجم کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے جوشؔ کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اُن کی کوتاہیوں کو بھی سامنے لایا ہے اور اُن لوگوں پر بھی نکتہ چینی کی ہے جنہوں نے اپنے مفادات کے لئے جوشؔ جیسے عظیم شاعر کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ اِس سلسلے میں وہ ''حرفِ آغاز'' میں لکھتے ہیں

''جوش کو غیر اہم شاعر ثابت کرنے اور اُن کی شہرت و مقبولیت کو کم کرنے میں نیاز فتح پوری کی تنقیدوں کو اچھا خاصا دخل ہے۔ ماہنامہ ''نگار'' کو مقبول بنانے کے لئے نیاز مرحوم کو زرد ادبی صحافت کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ کبھی وہ جگرؔ، اصغرؔ، فانیؔ اور جوشؔ جیسے مقبول شاعروں کے کلام پر اعتراضات کر کے خود کو عالم ثابت کرتے تھے اور کبھی مذہب اور خُدا کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کر کے علمائے کرام سے مورچہ لیتے تھے۔ اُنہوں نے کبھی ''نگار'' میں اپنے نام سے، کبھی درویش میرٹھی کے نام سے اور کبھی یوسف رضا کے نام سے جوشؔ پر منفی تنقیدی مقالے لکھے۔ چوں کہ جوشؔ کی شخصیت متنازعہ فیہ تھی، اِس لئے جگرؔ، اصغرؔ وغیرہ پر تو کوئی بُرا اثر نہیں پڑا لیکن جوشؔ کی مقبولیت خاصی متاثر ہوئی۔''

(ص-۱۰)

ڈاکٹر خلیق انجم کے مطابق جوشؔ سے خود بھی ایسی کئی غلطیاں سرزد ہوئیں جن سے اُن کی مقبولیت اور شہرت اثر انداز ہوئی ہے۔ اپنے اِس بیان کی وضاحت کرتے ہوئے وہ اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں:-

''جوش کی دُوسری غلطی ہجرتِ پاکستان ہے۔ ممکن ہے کہ پاکستان جا کر اُنہیں مالی اعتبار سے فائدہ ہوا ہو لیکن اُن کی شہرت اور مقبولیت بہت بُری طرح سے متاثر ہوئی۔ ہندوستان میں جو حیثیت جوشؔ کو حاصل تھی وہ بہت کم خوش نصیبوں کی قسمت میں ہوتی ہے۔ ہندوستان کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اُن کے ناز نخرے اُٹھاتے ہیں۔ اُن کی آمدنی اِطمینان بخش تھی۔ وہ ماہنامہ ''آجکل'' کے ایڈیٹر تھے۔ آل اِنڈیا ریڈیو سے منسلک تھے۔ مشاعروں سے اُن کی آمدنی اُن کے اُن معاصر شاعروں کے مقابلے میں بھی کہیں زیادہ تھی جن کا صرف مشاعروں پر ہی گزر بسر

تھا۔اِن سب باتوں کے علاوہ ملیح آباد میں اُن کے آموں کے باغ
تھے جن سے اچھی خاصی آمدنی تھی۔غرض یہ ہے کہ جوشؔ مالی اعتبار سے
بالکل آسودہ تھے لیکن مزید دولت حاصل کرنے کی ہوس نے اُنہیں
پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔"

(ص-۱۲)

بشیر الدین احمد نے نہ صرف جوشؔ کے اشعار سے اُن کی شخصیت کے مختلف گوشے اَخذ کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ اُنہوں نے جوشؔ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سے جوشؔ کی بادہ خواری، اُن کی شوخی اور حُسن پرستی کے ساتھ ساتھ اُن کی وطن پرستی، پسندیدہ موسموں اور پھلوں کی تفصیل، اُن کی علالت اور اُن کے مذہب جیسے موضوعات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اپنی اِس کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم اور بشیر الدین احمد کی ان تحریروں میں تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا پہلو بھی اپنے پوری آب وتاب کے ساتھ اُبھرتا ہے۔اِن دونوں حضرات کی تحقیق مشاہدے اور مطالعے پر مبنی ہے اور ان کی تنقید میں وزن اور وقار ہے۔ان دونوں حضرات نے جوشؔ کے نہ صرف مثبت پہلوؤں پر ہی غور کیا ہے بلکہ اُن کے منفی پہلو بھی اُجاگر کئے ہیں۔پروفیسر مسعود حسین خان کے مقالے میں بھی جوشؔ کی شخصیت کے بعض اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔موصوف نے جوشؔ کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری پر بھی مفصّل بحث کی ہے اور بعض اچھے نتائج اَخذ کئے ہیں۔

جوشؔ کی شاعری کا احاطہ کرنے کے لئے اِس کتاب میں چھ مقالات شامل ہیں، جن کی تفصیل کچھ اِس طرح ہے:۔

(۱) جوشؔ ملیح آبادی
(۲) جوشؔ کا تصوّرِ شاعری
(۳) جوشؔ کی شاعری میں لفظ ومعنی کا تناسب
(۴) جوشؔ ملیح آبادی: ایک عظیم شاعر اور اچھا انسان
(۵) جوشؔ کی شاعری کی اہمیت

(۶) شاعرِ حریت وفطرت: جوشؔ ملیح آبادی

یہ مقالات مسعود حسین خان، وارث علوی، رشید حسن خان، صبا اکبرآبادی، عبدالمغنی اور گوپی چند نارنگ جیسے عالموں اور دانشوروں کے ہیں، جن کا شمار برصغیر ہندوپاک کے صفِ اوّل کے محققین میں ہوتا ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خان کا مقالہ ''جوشؔ ملیح آبادی''، وارث علوی کا ''جوشؔ کا تصوّرِ شاعری'' اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقالہ ''شاعرِ حریت وفطرت: جوشؔ ملیح آبادی'' نہایت ہی پُرمغز اور فکرانگیز مقالات ہیں۔ یہ تمام مقالات مصنفین کی محققانہ ژرف نگاہی پر دال ہیں۔ اِن مقالات میں نہ صرف جوشؔ کی جمالیاتی اور اِنقلابی شاعری دونوں پہلوؤں پر بڑے دِلنشیں انداز سے غور کیا گیا ہے بلکہ جوشؔ کی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی اَزسرِ نو جایزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے اپنے مقالے میں جوشؔ کی شاعری کے ساتھ ساتھ اُن کے مزاج، اُن کے عادات واطوار اور جوشؔ کی اِنقلابی شاعری کو وقعتِ نظر سے ضبطِ تحریر میں لایا ہے، جب کہ وارث علوی نے جوشؔ کی شاعری کو نہ صرف انگریزی شعرأ کے تناظر میں پرکھا اور جانچا ہے بلکہ روایتی فارسی اور اُردو شاعری کے میزان بھی بروئے کار لائے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے مقالے میں اِس بات کی طرف بھی اِشارہ کیا ہے کہ مختلف نقادوں نے جوشؔ کی شاعری کے ساتھ اِنصاف نہیں کیا ہے اور نہ ہی سنجیدگی سے اُن کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جوشؔ کو شاعرِ حریت وفطرت قرار دیا ہے۔ دو لفظوں کی اِس ترکیب سے موضوع میں ایک نئی جہت پیدا ہوگئی ہے۔ اُن کے مطابق اقبالؔ کے بعد جوشؔ ہی ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری کا برصغیر کے طول وعرض میں ڈنکا بجا ہے۔ جوشؔ بنیادی طور پر رُومانی شاعر ہیں۔ اُن کا اِبتدائی کلام عشقیہ جذبات سے سرشار ہے۔ اِس میں جوانی کی ساری سرمستیاں اُمڈ آئی ہیں۔ اُٹھتی جوانی، یار پری چہرہ، مالن، شام کا رُومان، چاند کے اِنتظار میں تارے، بدلی کا چاند، خاتونِ مشرق وغیرہ نظمیں جوشؔ کے عشقیہ جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ بعد میں وہ اِنقلابی شاعری کی طرف مائل ہوئے اور اِس موضوع پر بھی بے شمار نظمیں لکھیں، جن میں وہ وطن کی آزادی کے نغمے اَلاپتے رہے اور برطانوی سامراج کو چیلنج کرتے رہے۔ جوشؔ نے بلاشبہ اپنی نظموں کے ذریعے سے کروڑوں ہندوستانیوں کے دُکھ درد کا مداوا کیا اور ساتھ ہی ساتھ اِنقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ اِس طرح سے وہ شاعرِ اِنقلاب کے نام سے جانے اور پہچانے

گئے۔ شکستِ زِندان کا خواب، زِندان کا گیت، رُوس کا رجز، زوالِ جہانبانی، کسان وقاف، ایسٹ اِنڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام، وزارتی وفد کا فریب، پندرہ اگست ۱۹۴۷ء، نو بہار جیسی نظمیں اُن کی اِنقلابی شاعری کی پوری پوری نمایندگی کرتی ہیں۔ حالانکہ جوشؔ کے معاصرین میں آزادی کے نغمے اَلاپنے والوں میں سے شبلی نعمانیؔ، چکبستؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، اکبرالہ آبادی جیسے شعرا بھی تھے، لیکن بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ، جوش ایک اِنفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنے اِس بیان کی وضاحت کرتے ہوئے موصوف اپنے مقالے میں رقمطراز ہیں:-

> "آزادی کے ترانے چھیڑنے والے جوشؔ اکیلے نہیں تھے۔ شبلی، حسرتؔ موہانی، چکبستؔ، اکبرالہ آبادی، اقبالؔ، ظفرعلی خان، اقبال سہیلؔ اور کئی دُوسرے شعرا سامراج دُشمنی کی فضا تیار کر چکے تھے لیکن جوشؔ کی آواز جوشؔ کی آواز تھی۔ اُن کی باغیانہ تڑپ اور گھن گرج سب سے الگ تھی۔ شاعرِ انقلاب کہلانے کا اعزاز کسی کو ملا تو صرف جوشؔ کو۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ شاعری کی سطح پر ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے قافلہ سالاروں میں سے تھے اور جس مجاہدانہ جوش وخروش اور ہمت و پامردی سے اُنہوں نے سامراج دشمنی اور اِنقلاب کے ترانے گائے اور انگریز کے خلاف بغاوت کی آگ کو سینوں میں دہکایا، وہ دونوں ملکوں کی قومی تاریخ کا حصہ ہے۔"
>
> (ص-۹۳)

صباؔ اکبرآبادی اور عبدالمغنی کے مقالات سے بھی جوشؔ کی شاعری کے بارے میں چند نئے اِنکشافات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ مقالات مواد اور موضوع دونوں اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان میں تحقیق کا پہلو نمایاں ہے۔ صباؔ اکبرآبادی کا مقالہ اِس لئے بھی اہم ہے کہ اُنہوں نے جوشؔ (مرحوم) کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ اُن کی موجودگی میں مشاعرے پڑھے ہیں اور وہ قبلہ جوشؔ صاحب سے متعدد بار شریکِ گفتگو ہوئے ہیں۔ صباؔ اکبرآبادی نے جوشؔ کو اپنے اِس مقالے میں ایک عظیم شاعر اور متین اِنسان قرار دیا ہے۔ اُن کے مقالے سے جوشؔ کی جوانی کی تصویر سامنے آتی ہے اور نہ صرف

جوشؔ کی ذات سے متعلق چند بہت ہی اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ جوشؔ کی زبان دانی، اُن کی محاورہ بندی، اُن کی شاعری اور اُن کی بذلہ سنجی کے بارے میں بھی بھرپور اِشارے ملتے ہیں۔ صباؔ اکبرآبادی نے جوشؔ کی قادرالکلامی، سنجیدگی اور اُن کی متانت کا بھی ذِکر کیا ہے۔ اُن کے مطابق زبان کے غلط اِستعمال سے جوشؔ صاحب بددل ہوجاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے سامنے اہلِ زبان بھی گفتگو کرتے وقت اِحتیاط سے کام لیتے تھے۔ کیونکہ جوشؔ صاحب زبان کے معاملے میں کسی سے بھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ وہ غلط زبان بولنے پر بڑے سے بڑے آدمی کو بھی سرِ محفل ٹوکتے تھے۔ اپنے مقالے میں اِس کلیئے کی وضاحت کرتے ہوئے صباؔ اکبرآبادی لکھتے ہیں:-

> ''زبان کا غلط اِستعمال جوشؔ صاحب کے لئے دشنام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُن کے سامنے لب کشائی کرتے ہوئے اہلِ زبان بھی اِنتہائی محتاط رہتے تھے۔ الفاظ کے غلط اِستعمال پر وہ برجستہ بڑے سے بڑے آدمی کو سرِ محفل ٹوک دیتے تھے۔ اُن کی اِس صاف گوئی اور بیباکی نے اُن کے حریفوں کی ایک بڑی جماعت پیدا کردی جو اُن کی موت کے بعد بھی اُن پر حملے کرنے سے باز نہیں آئی۔''
>
> (ص-۷۲)

''جدید اُردو مرثیے کے خدوخال- مراثیِ جوشؔ کے آئینے میں'' کاظم علی خاں کا مقالہ ایک الگ اور اِنفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ مقالہ بھی شاعری کے زُمرے میں آتا ہے لیکن اپنے موضوع کی مناسبت سے اِنفرادی درجہ رکھتا ہے۔ اِس مقالے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جوشؔ نہ صرف غزل اور نظم کے ہی مردِ میدان تھے بلکہ وہ دُوسری شعری اَصناف میں بھی کمال رکھتے تھے۔ اُن کے مراثی میں عصری مسائل کی ترجمانی جابجا ملتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں جوشؔ کی نثر نگاری پر تین مقالات شامل ہیں۔ اِن تینوں مقالوں میں ''یادوں کی برات'' کے تناظر میں جوشؔ کی نثر نگاری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جوشؔ کی شخصیت میں چند اَہم واقعات اور حادثات اُنہی کی کتاب ''یادوں کی برات'' سے اُبھارنے کی مستحسن کوشش کی گئی ہے۔ یہ تینوں مقالات اِس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ اُن میں نہ صرف جوشؔ کی نثر کی خصوصیات ہی دیکھنے میں آتی ہیں بلکہ اُن کے تنقیدی

نمونے بھی جا بجا فراہم ہوتے ہیں۔

سید حامد نے اپنے مقالے میں اُن واقعات کی نشاندہی کی ہے جن کو جوشؔ خود پسندی کی عینک سے دیکھا کرتے تھے۔ اپنے معاصرین میں سے جوشؔ، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، فانیؔ، اقبالؔ، فراقؔ، مجازؔ جیسی شخصیات کا ذِکر بھی اپنی تصنیف ''یادوں کی برات'' میں کرتے ہیں اور اُن کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اُن کی کوتاہیوں کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں۔ جوشؔ، پنڈت نہرو کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ ایک جگہ رقمطراز ہیں:-

''اُن کا وجود ہندوستان کا اِفتخار، ایشیا کا وقار
اور عالمِ انسانیت کا اعتبار تھا اور وہ اِس عالمِ اجسام کے ایک ذی حیات
تاج مَحل تھے، جس کو اَودھ کی ملاحت اور صبحِ بنارس کی صباحت نے اِلہٰ آباد
کے معنی خیز سنگم پر گنگا جمنی چھینیوں سے تراش کر تعمیر کیا تھا۔''

(''یادوں کی برات''، از: جوشؔ ملیح آبادی، بحوالہ جوشؔ ملیح آبادی: تنقیدی جائزہ، ص-۷۹)

سید حامد کا یہ مقالہ قابلِ مطالعہ ہے اور جوشؔ کی زندگی کے تلخ حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔

نامیؔ انصاری کا مقالہ ''یادوں کی برات پر ایک نظر'' بھی جوشؔ کی گوناگوں علمی وادبی خدمات پر دال ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جوشؔ شناسوں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے مقالے میں جوشؔ کی نظم ونثر دونوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن کی خود نوشت سوانح حیات ''یادوں کی برات'' کا تنقیدی جایزہ پیش کیا ہے۔ اُنہوں نے اِس کتاب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں جوشؔ کے بچپن سے لے کر ۱۹۷۳ء تک کی زندگی کی رُوداد ملتی ہے۔ اِس حصّے میں جوشؔ کی نہ جانے کتنی تلخ ترش اور شیریں یادیں سمٹ آئی ہیں۔ یادوں کا یہ البم جوشؔ کی ۷۳ سالہ زندگی پر محیط ہے۔ صاحبِ مضمون اُن یادوں کو ایک دِلچسپ آدمی کی دِلچسپ رُودادِ حیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ جنہیں اپنی آرزوؤں اور اَرمانوں سے پیار ہے اور جو صحیح معنوں میں لفظوں کا اَداشناس ہے۔ ''یادوں کی برات'' کا دُوسرا حصّہ جوشؔ کے عزیز واَقارب اور اُن کے دوستوں کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اِس حصے میں جوشؔ کی مرقع کاری کے عمدہ نمونے فراہم ہوتے ہیں۔ ایک شخصیت کو اُبھارنا اور اُس کی سیرت کا نقشہ کھینچنا اور پھر اُس کے کارہائے نمایاں کو اُجاگر کرنا کتنا دُشوار گذار مرحلہ ہے اُس مرحلے کو نامیؔ انصاری نے اپنے قلم سے بڑی

خوش اسلوبی سے نبھایا ہے، جس کے لئے وہ لایق ستائش ہیں۔ نامیؔ انصاری کے اِس مقالے کا یہ اقتباس یہاں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ جوشؔ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر اور نثر نگار ہی تھے بلکہ وہ ایک اچھے اِنسان بھی تھے:۔

> ''مجموعی طور سے یوں کہنا چاہئے کہ ''یادوں کی برات'' جوشؔ کی اپنی شخصیت کا ہو بہو عکس ہے۔ جس پیچ و خم اور جلال و جمال کی آمیزش سے جوشؔ کی شخصیت کی تعمیر ہوتی تھی۔ وہی لفظوں میں ڈھل کر ''یادوں کی برات'' بن گئی ہے۔ اِس کتاب کی اہمیت یہ نہیں کہ یہ ایک عظیم شاعر کی عظیم داستانِ حیات ہے۔ یہ ''تذکرہ''، ''اعمال نامہ'' یا ''کارِ جہاں دراز ہے'' بھی نہیں ہے۔ بلکہ یہ جوشؔ کی سیرت اور شخصیت کی ایسی دُنیا ہے جس میں بروئے ہر جہت درِ آئینہ باز نظر آتا ہے اور جوشؔ نہ خود کو چھپا سکتے ہیں، نہ اپنی اندرونی لرزشوں کو۔ مگر یہ پُرخطر داستانِ حیات جوشؔ ہی لکھ سکتے تھے کیونکہ اُن میں ہزار خرابیاں رہی ہوں گی مگر وہ ریاکار ہرگز نہ تھے اور اُن کی یہی خوبی اُن کی تمام خرابیوں پر غالب آجاتی ہے۔''
>
> (ص-۱۶۳)

''جوشؔ بحیثیت نثر نگار'' سکھ چین سنگھ ٹھاکر کا مقالہ ہے۔ اِس میں اُنہوں نے جوشؔ کو ایک الگ اور اِنفرادی انداز میں پیش کیا ہے۔ اُنہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جوشؔ نہ صرف اقبالؔ کے بعد اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں بلکہ وہ ہردلعزیز نثر نگار بھی ہیں۔ جن کی نثر سادہ، صاف اور شُستہ ہے اور یہی سادگی اور شیرینی اُن کی شاعری کا بھی حاصل ہے۔ فاضل مضمون نگار نے جوشؔ کی نظم و نثر کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف جوشؔ کی نثر نگاری پر ''یادوں کی برات'' کے تناظر میں روشنی ڈالی ہے۔ بلکہ روایتی میزانوں کو بھی بروئے کار لایا ہے۔ اُنہوں نے جدید تنقیدی اُصول اپنا کر جوشؔ کی نثر نگاری پر مدلّل بحث کی ہے۔ ڈاکٹر سکھ چین سنگھ ٹھاکر اُردو کے ایک خاموش خدمت گذار ہیں۔ وہ پہلے ہی ''مختصرات و منتشرات جوشؔ'' کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کر چکے ہیں۔ جس میں

جوشؔ کی نایاب تحریریں شامل ہیں۔ یہ موصوف کا ایک نہایت ہی عمدہ اَدبی کارنامہ ہے۔ اِس طرح سے جوشؔ کو سمجھنے اور اُن کو پرکھنے میں دِقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے بلکہ اُنہوں نے نہایت ہی خوش اسلوبی سے جوشؔ کی نثر نگاری کی صفات اُبھار کر جوشؔ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے راستہ ہموار کیا ہے، جو بڑی بات ہے۔

تاراچرن رستوگی کا شمار اِس دور کے اہم نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے ''جوشؔ ملیح آبادی اپنے معاصر مشاہیر کی نظر میں'' کے نام سے ایک قابلِ مطالعہ مقالہ لکھا ہے۔ اِس میں جوشؔ کے قریبی معاصرین میں سے فراقؔ، اثرؔ لکھنوی، رام بابو سکسینہ، مجازؔ، یگانہ یاسؔ چنگیزی، فانیؔ بدایونی اور ساغرؔ نظامی وغیرہ سے جوشؔ کے روابط کی ایک ہلکی سی تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ صاحبِ مضمون نے صاف اور سلیس زبان میں جوشؔ کی زندگی کے کئی گوشے قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

کتاب میں شامل ''تصانیفِ جوشؔ'' کے نام سے ضیاالدین انصاری کا خاکہ بھی شامل ہے، جس کی اہمیت اور افادیت سے انکار کرنا کور ذوقی ہوگی۔ اِس خاکے سے جوشؔ کے تمام شعری اور نثری مجموعوں کی فہرست سلسلہ وار سامنے آتی ہے۔ ''مندرجات اور متفرق مضامین'' میں بھی اُن کا پورا جائزہ لیا گیا ہے۔ ''مطالعہ جوشؔ'' میں جوشؔ کی سوانح، شخصیت اور اُن کے فن پر کتب، رسائل و متفرق مضامین کی مکمل معلومات کے ساتھ سلسلہ وار نشاندہی کی گئی ہے۔ اُن رسائل اور جرائد کے خصوصی شماروں کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے جن کے جوشؔ کی حیات یا اُن کی رحلت کے بعد جوشؔ نمبر شائع ہوئے ہیں۔ افکار (کراچی)، الفاظ (علی گڈھ)، ساقی (کراچی)، سفینہ (پٹنہ) صرف چند رسائل و جرائد کے جوشؔ نمبرات ہیں، جن میں مرحوم جوشؔ کی زندگی اور اُن کے فن کی پوری پوری عکاسی کی گئی ہے۔ زیرِ تبصرہ خاکے کے آخیر میں جوشؔ کے تیئں منظوم خراجِ عقیدت کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے، جس کی اہمیت سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا۔

''جوشؔ ملیح آبادی (تنقیدی جائزہ)'' شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کی شخصیت اور فن پر ایک مکمل اور جامع تصنیف ہے۔ لیکن بعض اہم شخصیات کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اِس سلسلے میں پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ آزادؔ صاحب نے قبلہ جوشؔ کے ساتھ اچھے خاصے دِن گزارے ہیں، لہٰذا اُن کے ساتھ جوشؔ کی بہترین یادیں وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم، آزادؔ صاحب سے جوشؔ کی اُن

یادوں پر مشتمل ایک مضمون لکھوا کر کتاب میں شامل کرتے تو اِس کتاب کی افادیت میں اور بھی اِضافہ ہو جاتا ۔اِسی طرح سے موصوف نے جوشؔ کے معاصرین میں سے قتیلؔ شفائی،احمد ندیم قاسمی ، علی سردار جعفری جیسے شاعروں اور ادیبوں سے بھی مضامین حاصل کر کے شامل کتاب کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اِس طرح سے جوشؔ کی زندگی اور اُن کے فن کے اور بھی کئی پہلو قارئین کے سامنے آ جاتے۔ بہر حال ''جوشؔ ملیح آبادی (تنقیدی جائزہ)'' میں جو بھی مواد شامل ہے ،وہ جوشؔ کی فکر وفن کے مختلف گوشوں کو منظر عام پر لانے میں مستحسن قدم ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی نثری تصانیف

پروفیسر جگن ناتھ آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ محقق بھی ہیں اور تذکرہ نگار بھی، اُنھوں نے خاکے بھی لکھے ہیں اور مضامین بھی۔ وہ ماہرِ اقبالیات کی حیثیت سے بھی اپنا لوہا منوا چکے ہیں اور بہ حیثیت اِنشاپرداز بھی بَرِصغیر ہندو پاک میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کے یہاں شاعری کے ساتھ ساتھ ایک بصیرت افروز تنقیدی ذہن بھی مِلتا ہے۔

شاعری سے قطع نظر جب ہم آزاد صاحب کی نثر نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کا ایک بہت ہی نمایاں پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آزاد صاحب ایک غیر جانبدار محقق اور ایک متوازن شخصیت نگار بھی ہیں۔ نثر نگاری سے اُن کی بے پناہ محبت اور دِل چسپی کا بیّن ثبوت اُن کی بے شمار تصانیف ہیں جن میں اِقبال کے فِکر و فن سے متعلق تخلیقات بھی ہیں اور سفر نامے بھی، تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی ہیں اور علمی و ادبی شخصیات کے حوالے سے مقالات کے مجموعے بھی۔ لیکن اُن کا پہلا عشق اِقبالؔ ہے اور اِسی جذبہ عشق نے اُنھیں اِقبالؔ کے فکر و فن کے مختلف گوشوں کی بازیافت کرنے پر آمادہ کیا۔

پروفیسر آزادؔ کو ایک بہت ہی زرخیز اَدبی ماحول وراثت میں مِلا۔ اُن کے والد تلوک چند محرومؔ صاحب اپنے عہد کے ایک نامور شاعر تھے۔ اُن کے یہاں اکثر شعر واَدب کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں، اُن محفلوں میں حفیظؔ جالندھری، ہری چند اخترؔ، عبدالعزیز فطرتؔ، ضیاؔ سرحدی، اظہرؔ امرتسری، عبدالحمید عدمؔ اور کئی دُوسرے سرکردہ شعرا اکثر شامل ہوتے تھے۔ اسی ادبی ماحول میں آزادؔ صاحب کی شاعری پروان چڑھی لیکن اُنھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کے شعبے کو بھی سنجیدگی سے اپنایا۔ اُن کا پہلا

تنقیدی مقالہ ۱۹۳۸ء میں ''ہمایوں'' لاہور[1] میں شائع ہوا جو اقبالؔ کے فکر و فن سے متعلق تھا۔ اِس کے بعد وہ نثر نگاری کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے اور اُن تمام شعبوں میں اُنھوں نے اپنی اِنفرادیت برقرار رکھی۔

اِقبالیات کے موضوع پر آزادؔ صاحب کا کام بڑا وقیع ہے۔ اِس شعبے میں اُن کی تصانیف علاّمہ اقبالؔ کے تئیں اُن کی گہری عقیدت کی غمّاز ہیں۔ اُنھوں نے اس عظیم فلسفی اور شاعر کو نہ صرف اپنی شاعری کے توسّط سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ اپنی دِلکش نثر کے ذریعے بھی اقبالؔ کے فلسفے اور اُن کے پیغام کو عوام تک پہنچایا ہے۔ اِس ضمن میں علاّمہ نیاز فتحپوری نے آزادؔ صاحب کو نہ صرف ایک بلند فِکر شاعر قرار دیا ہے بلکہ اُن کی نثر پر بھی دِل کھول کر داد دی ہے۔ اِقبالیات سے متعلق آزادؔ کی تصانیف کو اِقبالیات میں ایک اِضافہ قرار دیتے ہوئے علاّمہ لکھتے ہیں:-

> ''جگن ناتھ آزادؔ نہ صرف شاعر بلکہ نقّاد کی حیثیت سے بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ اقبالؔ اِبتدا ہی سے اُس کا محبوب شاعر رہا ہے۔ آزادؔ والہانہ حد تک اقبالؔ کے مدّاح ہیں لیکن اِن مضامین میں اُن کی شیفتگی نے کسی جگہ غیر منطقی شیفتگی کی صورت اِختیار نہیں کی۔ اِقبالؔ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آزادؔ نے جو کچھ اِن مضامین میں لکھ دیا ہے وہ اقبالیات میں ایک اضافہ ہے''۔[2]

پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، علاّمہ اقبالؔ کے پرستاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی فکر اِنگیز تصانیف ''اقبالؔ اور اُس کا عہد''، ''اقبالؔ اور مغربی مفکرین''، ''اقبالؔ کی کہانی (سوانحِ حیات بچوں کے لیے)''، ''فکرِ اقبالؔ کے بعض اہم پہلو''، ''اقبالؔ: زندگی، شخصیت اور شاعری''، ''محمد اقبالؔ: ایک اَدبی سوانح''، ''بچوں کا اقبالؔ'' اور ''اقبالؔ اور کشمیر''، اقبالؔ کے تئیں اُن کی محبت اور دِل چسپی کا ثبوت ہیں۔ آزادؔ صاحب نے اقبالؔ کی شخصیت اور شاعری کو ایک نئے زاویے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبالؔ کے کلام اور اُن کی تحریروں کا آزادؔ صاحب نے نہ صرف گہرا مطالعہ کیا ہے بلکہ اِقبالیات سے متعلق جس قدر مواد دستیاب ہو سکا ہے، اُس پر بھی اُن کی گہری نظر ہے۔ چنانچہ اپنی ایک کتاب میں اس

---

1. ڈاکٹر محمد اسد اللہ دانی: اقبال اور آزاد، ص ۱۹۹
2. کتاب نما (خصوصی شمارہ) پروفیسر جگن ناتھ آزاد: شخصیت اور ادبی خدمات، ص ۹۱

پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اقبالؔ کے بارے میں جتنی کتابیں اِس برِ صغیر میں لکھی گئی ہیں اُتنی باہر لکھی نہیں گئیں۔ مختلف نقادانِ علم وفن نے اقبالؔ کو اپنے اپنے انداز سے خراجِ تحسین بھی ادا کیا ہے اور اُن کی شاعری کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ میں اُن نقادوں کی تصانیف کے بارے میں یہاں کچھ زیادہ تفصیل سے کہنا مناسب خیال نہیں کرتا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور علامہ اقبالؔ کی شاعری سے مجھے شغف ہوا ہے یہ کتابیں، جن کی تعداد میں روز افزوں اِضافہ ہو رہا ہے، میرے پیشِ نظر رہی ہیں اور میں نے اِن سے بقدرِ استطاعت فیض اُٹھایا ہے۔"[۱]

"اقبالؔ اور اُس کا عہد"، جگن ناتھ آزادؔ کی ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ یہ اُن کے تین لیکچروں پر مشتمل ہے جو اُنھوں نے جموں وکشمیر یونی ورسٹی کی دعوت پر لکھے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی اور تب سے لے کر اَب تک اِس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جن میں "اَلادب" لاہور (پاکستان) کا ۱۹۸۹ء کا ایڈیشن بھی شامل ہے۔ اِس طرح سے اِس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اِس کتاب میں شامل مقالات میں آزادؔ صاحب نے علامہ اقبالؔ پر عائد کیے گئے فِرقہ پرستی کے اِلزام کی پُرزور تردید کی ہے اور اُنھیں وطن پرست شاعر قرار دیا ہے۔ آزادؔ صاحب کے مطابق اقبالؔ کے ہاں تصوف کی متعدد کیفیات اور بنیادی نکات موجود ہیں اور اُنھوں نے اقبالؔ کے اِسلامی تصوف کی روشنی میں بھی اپنے نظریات اِس انداز میں پیش کیے ہیں کہ اقبالؔ پر لگائے گئے تعصب اور تنگ نظری کے اِلزامات کو رَد کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اِس کتاب میں آزادؔ صاحب نے جس دِل نشیں پیرائے میں اقبالؔ اور اُس کا عہد متعین کیا ہے، وہ اُن کی مستحسن کوشش ہے۔

"اقبال اور مغربی مفکرین" آزادؔ صاحب کا ایک اور گراں قدر نثری کارنامہ ہے۔ اقبالؔ کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں بقولِ آزادؔ اِسلامی تفکر کے ساتھ ساتھ قدیم ہندوستانی فلسفہ، مغربی فلسفہ اور

---

۱ پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ: اقبال اور [illegible]

مارکس اور اینگلز کا جدلیاتی مادّی نظامِ فکر بھی شامل ہے۔ پروفیسر آزادؔ، اقبالؔ کو ایک وسیع النظر فلسفی شاعر قرار دیتے ہیں جنھوں نے اپنے قیامِ یورپ کے دوران بیکن، لاک، کانٹ، شوپن ہائر، نٹشے، برگساں، دانتے، کارل مارکس، فیختے، ملٹن اور گوئٹے ایسے مغربی مفکّرین و مصنفین کے نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ پروفیسر آزادؔ نے نہایت ہی ایمانداری سے اقبالؔ کے فکروفن کا موازنہ ان اکابرین کے ساتھ کر کے نتیجہ اَخذ کیا ہے۔ اِس تصنیف میں مستعمل زبان و بیان کا پیرایہ بھی قابلِ داد ہے۔

''اقبال اور کشمیر'' آزادؔ صاحب کی ایک عمدہ تصنیف ہے۔ اِس نثری شاہکار میں آزادؔ صاحب نے کشمیریات کے تعلق سے اقبالؔ کے فکروفن کا احاطہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اسداللہ وانی کے مطابق آزادؔ صاحب کی یہ تصنیف'' اقبال اور کشمیر'' کے تعلق سے ایک نئے باب کا آغاز ہے۔[1] کشمیر چوں کہ اقبالؔ کے آباواَجداد کی سرزمین رہی ہے اِس لیے اقبالؔ کو بھی کشمیر سے والہانہ لگاؤ رہا اور اُنھوں نے یہاں کے کلچر اور تہذیب و تمدن کو ہمیشہ عزیز سمجھا۔ اِقبالؔ کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ کشمیری عوام جہالت کے شکنجے سے آزاد ہوں۔ اِس لیے اُنھوں نے یہاں کے عوام کو بیدار کرنے کی ہر ممکن سعی کی، جس کا عکس اُن کی شاعری اور نثری اَفکار میں ہر جگہ ملتا ہے۔ آزادؔ صاحب نے اقبالؔ اور اہلِ کشمیر کے اُسی فکری اور جذباتی لگاؤ کو اِس کتاب میں پیش کیا ہے۔ اقبالؔ اور کشمیر، کشمیری میگزین، مشاہیرِ کشمیر، اقبالؔ کے خطوط محمد الدین فوق کے نام، انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور، اقبالؔ کا سفرِ کشمیر، اور نیٹشے سے غنی کاشمیریؔ تک جیسے موضوعات پر آزادؔ نے بڑے فن کارانہ انداز میں قلم چلایا ہے اور اِس پر اُن کی نثر سونے پر سہاگہ ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں اقبالؔ کو آزادؔ صاحب کا پہلا عشق قرار دیتے ہیں، جنھوں نے ریاست میں اپنے قیام کے دوران بہت سی قابلِ قدر کتابیں لکھیں اور اقبالؔ کے اُن گوشوں کی بازیافت کی جو تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ موصوف ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

> ''پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کا پہلا عشق اقبالؔ ہے۔
> ریاست میں اپنے قیام کے دوران اُنھوں نے اقبالؔ اور کشمیر، اقبالؔ
> اور مغربی مفکرین، نشانِ منزل جیسی کتابیں لکھیں۔ آزادؔ صاحب ایک
> صاحبِ نظر محقق اور ناقد ہیں۔ اُنھوں نے اقبالؔ کے کئی ایسے پہلوؤں

---

[1] ڈاکٹر اسداللہ وانی، اقبالیات آزاد، ص ۱۴۱

کی طرف توجہ دلائی ہے جو گوشہ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے''۔[1]

''ہندوستان میں اِقبالیات: آزادی کے بعد'' بھی پروفیسر آزاد کی ایک فکر انگیز کتاب ہے۔ اِس کتاب میں، ہندوستان میں اِقبالیات: آزادی کے بعد، اِقبال: مغربی مفکرین کی نظر میں، اِنسان: اقبال کی نظر میں اور اقبال اور جوش جیسے موضوعات پر بحث ملتی ہے۔ آزاد صاحب کی نثر میں اِقبالیات سے متعلق جو دُوسری تصانیف موجود ہیں، اُن میں ''بچوں کا اقبال''، ''IQBAL: MIND AND ART'' اور ''اقبال: زندگی، شخصیت اور شاعری'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علمی و اَدبی اہمیت کے حامل اِن نثری فن پاروں میں بھی فکرِ اقبال کے لاتعداد گوشوں کو عیاں کیا گیا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کئی سفرنامے بھی قلم بند کیے ہیں۔ ان سفرناموں میں بھی نثرِ آزاد کی بہترین جھلکیاں سامنے آتی ہیں۔ آزاد صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ حقیقت بیانی سے کام لیتے ہیں۔ وہ ہر ایک چیز کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اپنے قلم کی نوک سے اس کو زبان دیتے ہیں، جس سے اُن کی تحریروں میں وزن اور وقار پیدا ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے سفرناموں کو بے جا طوالت سے خشک اور سپاٹ نہیں ہونے دیا ہے بلکہ اِن میں اپنی فکر و نظر کی بالیدگی سے تازگی اور توانائی عطا کی ہے۔ پروفیسر آزاد نہ صرف اپنے سفر کا ذِکر سرسری طور پر کرتے ہیں بلکہ وہ اُس ملک کے کلچر، تہذیب و تمدن اور اَدب کو بھی ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں، جس ملک کی وہ سیاحت کرتے ہیں۔ اِس لحاظ سے وہ ایک ادیب کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں اور ایک مورّخ کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔

آزاد صاحب کی اوّلین نثری تصنیف ''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' ہے جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اُس میں وہ ڈاکٹر عبدالحق کے سفرِ حج کے تاثرات بیان کرتے ہوئے ہندوستانی اور پاکستانی روپے کا موازنہ بھی کرتے ہیں اور مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والے نارائن راؤ کی اُردو دوستی سے بھی محظوظ ہوتے ہیں، جن کی گفتگو نے آزاد صاحب کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا کہ مراٹھا، اُردو زبان و اَدب سے محبت نہیں کرتے ہیں۔ آزاد صاحب سچے معنوں میں اُردو کے بہی خواہ ہیں۔ تقسیمِ ہند اور پولیس ایکشن کے بعد جب حیدرآباد میں سیاسی اور معاشی سطح پر بہت سے مسائل اُبھرے تو اُردو زبان بھی اس کی زد میں آ گئی۔ لیکن کسی نے اُردو کی حالتِ زار پر اُف تک نہیں کی۔ آزاد صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے سفر کے

---

[1] ڈاکٹر برج پریمی، جلوۂ صد رنگ، ص ۲۲

دوران حیدر آباد میں اُردو زبان و اَدب کا حال دریافت کیا اور صورت حال کو تسلّی بخش پا کر اِطمینان کا سانس لیا۔

''کولمبس کے دیس میں'' آزادؔ صاحب کا دُوسرا سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ اُن کی ۱۹۸۱ء کی امریکہ اور کینیڈا کی یادوں پر مشتمل ہے اور اِنتہائی دِل چسپی کا حامل ہے۔ اگر چہ آزادؔ صاحب کی امریکہ کی سیاحت کا وہ پہلا موقع تھا لیکن امریکہ میں اُن کے قدردانوں کی وجہ سے اُنھیں وہاں کسی قسم کی اَجنبیت کا احساس نہ ہوا۔ آزادؔ صاحب کے اس سفر نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امریکہ کے قدرتی مناظر سے بھی لُطف اندوز ہوئے اور سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی سے بھی۔ امریکہ اور کینیڈا میں اُردو زبان و اَدب کی مقبولیت دیکھ کر پروفیسر آزادؔ بہت ہی متاثر ہوئے ——— خاص طور پر اُن کے اس سفر نامے سے اِس بارے میں بھی بھر پور جانکاری ملتی ہے کہ اُن ممالک میں اقبالؔ کے فکر و فن پر کس قدر کام ہو رہا ہے۔ علم و اَدب کے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کا ذکر بھی اس سفر نامے میں موجود ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ نے ''پشکن کے دیس میں'' کے نام سے بھی ایک عمدہ اور قابلِ قدر سفر نامہ لکھا ہے۔ ۱۰۴ صفحات پر مشتمل اس سفر نامے میں اُنھوں نے اپنے تین ہفتوں کے قیامِ رُوس کی مصروفیات کو قلم بند کیا ہے۔ انور سدید، آزادؔ صاحب کے اس سفر نامے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> ''جگن ناتھ آزادؔ ایک ایسے زائر نظر آتے ہیں جو ماسکو کے بجائے کتابوں کی یاترا کر رہے ہیں اور کتابیں لکھنے والوں سے ملاقاتیں ہی اُن کی زندگی کا بالعموم اور اس سفر نامے کا حاصل ہے''۔ [1]

پروفیسر آزادؔ نے رُوس کے معاشی اور معاشرتی حالات کا جائزہ بھی اس سفر نامے میں بڑے مؤثر انداز میں لیا ہے۔ وہ رُوس کے علمِ دوست حضرات سے ہم کلام بھی ہوئے اور ماسکو یونی ورسٹی میں اُنھوں نے اپنا مقالہ بھی پیش کیا۔ لینن میوزیم میں بھی چند لمحے گزارے اور تالستائی میوزیم بھی گئے، جہاں اُنھوں نے اس عظیم ادیب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس سفر نامے میں پروفیسر آزاد اکثر جگہوں پر

---

[1] ڈاکٹر خلیق انجم، جگن ناتھ آزاد: حیات اور اَدبی کارنامے، ص ۲۰۲

مناظر قدرت کا ذِکر بھی کرتے ہیں۔ چونکہ اُنھیں کشمیر سے لگاؤ ہے، اِس لیے اُنھیں رُوس میں جگہ جگہ کشمیر کے سرسبز اور شاداب مناظر نظر آتے ہیں۔ اِس سفرنامے میں آزادؔ صاحب کا خلوص جگہ جگہ ٹپکتا ہے۔ وہ سادہ زبان اور دِلکش اسلوب میں اپنی بات کہنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ پروفیسر ظہورالدین نے آزادؔ صاحب کے اِس سفرنامے کو اُردو کے ادبی خزانے میں اہم اضافہ قرار دیا ہے۔ [1]

''حیاتِ محرومؔ'' میں آزادؔ صاحب نے اپنے والد اور اُردو کے صفِ اوّل کے شاعر (مرحوم) تلوک چند محرومؔ کی شخصیت اور فن کا احاطہ کیا ہے۔ اس میں اُنھوں نے محرومؔ صاحب کے دور کا تاریخی اور سماجی پس منظر پیش کرتے ہوئے اکبرالہٰ آبادی، سر شیخ عبدالقادر اور اقبالؔ کے ساتھ محرومؔ کے مراسم کا بھی ذکر کیا ہے۔ ''حیاتِ محرومؔ'' سے یہ بات بھی کُھل کر سامنے آتی ہے کہ اقبالؔ، محرومؔ صاحب کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُنھیں اُردو شاعری کا کیٹس کہتے تھے۔ اِس کے ساتھ ساتھ زیرِ بحث کتاب میں آزادؔ صاحب نے تقسیمِ ہند کے المناک واقعات اور اُن کے آبائی مکان عیسیٰ خیل (مغربی پاکستان) میں آراستہ ہونے والی اَدبی محفلوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ والد کے احباب میں سے وہ جوشؔ ملیح آبادی، حفیظؔ جالندھری، عبدالحمید عدمؔ، احسان دانشؔ، ہری چند اخترؔ، امتیاز علی تاجؔ، برج موہن کیفیؔ، عبدالمجید سالکؔ، صوفی تبسّمؔ، مولانا تاجورؔ نجیب آبادی، صلاح الدین احمد، مولانا ظفر علی خان اور عابد علی عابدؔ ایسے مشاہیر کا ذکر جابجا کرتے ہیں۔ یہ کتاب محرومؔ صاحب پر ایک ''اِنسائیکلوپیڈیا'' کا درجہ رکھتی ہے اور اُن کے بچپن سے وفات تک کی پوری پوری تفصیل قاری کو فراہم کرتی ہے۔ اس کتاب میں آزادؔ صاحب کا مخصوص اسلوب بھی جگہ جگہ عیاں ہے۔

''آنکھیں ترستیاں ہیں'' اور ''نشانِ منزل'' پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کی متفرق موضوعات پر دو تصانیف ہیں، جن کی اِنفرادیت سے اِنکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آزادؔ صاحب کی دیباچہ نگاری بھی اُن کی غیر معمولی ذہانت کی نشاندہی کرتی ہے۔ بیسیوں قلم کاروں کے شعری اور نثری مجموعوں پر اُنھوں نے نہایت ہی فکر انگیز دیباچے اور مقدمات رقم کیے ہیں۔ بعض تصانیف پر اُنھوں نے تقاریظ بھی لکھی ہیں اور آرا بھی۔ اور ہر اعتبار سے اُن کی تحریریں نثر کے بہترین اور منفرد نمونے ہیں۔ اُن کے دیباچے اور مقدمات ایک وقیع سرمایہ ہیں اور تحقیق و تنقید کے گنجینے میں بیش قیمت لعل و گوہر کی سی حیثیت رکھتے

---

[1] ڈاکٹر ظہورالدین، ارمغانِ آزاد، ص ۱۸۷

ہیں۔علمی واَدبی لحاظ سے بھی ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔آزاؔد صاحب کے حواشی بھی غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔یہ اُن کی محنت، ذہانت اور خداداد صلاحیت ہی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اُردو زبان واَدب کے حوالے سے بعض ایسی چیزوں کو تلاش کیا جن پر زمانے کی ناقدری کی دُھول جمی ہوئی تھی۔

پروفیسر آزاؔد کے ہاں آج کل کے بہت سارے نقادوں کی طرح اَشعار اور اِقتباسات کی بھرمار نہیں ملتی ہے۔لیکن وہ اپنی تنقیدوں میں کتابوں اور اَدبی شخصیتوں کے نام اور اَدبی تحریکوں سے متعلق واضح اِشارے ضرور کرتے ہیں اور اِس طرح اپنی تحقیق وتنقید کو باوزن بناتے ہیں۔وہ ایسی نثر پسند کرتے ہیں جس میں نہ صرف علمیت کا مظاہرہ کیا گیا ہو بلکہ خیال بھی سُتھرا اور نکھرا ہوا ہو۔

آزاؔد صاحب کی تحریروں میں داخلی وحدت ہے۔قیاس آرائیوں پر عمل کرنا اُن کے مزاج میں نہیں ہے بلکہ وہ پہلے تحقیق کرتے ہیں اور اُس کے بعد وضاحت کے ساتھ اپنا نظریہ بیان کرنے کے قائل ہیں۔ فکر انگیز خیالات کو تحریر کرتے وقت منفرد انداز اِختیار کرنا اُن ہی کا خاصہ ہے۔تنقیدی میزانوں کو اپناتے وقت وہ تعصب سے کام نہیں لیتے ہیں اور نہ ہی فیصلہ دیتے وقت دُور کی کوڑی لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے انوکھے انداز میں بات کہنے کا گُر رکھتے ہیں۔زبان وبیان کے معاملے میں بھی وہ بڑے محتاط ہیں۔مختصر یہ کہ آزاؔد صاحب نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کے شعبے میں بھی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

دینا ناتھ مستؔ کاشمیری کی شاعری

مستؔ کاشمیری اپنے دور کے منفرد شاعر تھے۔ وہ ایک قابلِ قدر صحافی بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ مضامینِ مستؔ کے نام سے اُن کے منتخب مضامین[1] کا مجموعہ بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ فردوسِ خیال، اِلہاماتِ مستؔ اور رنگ ونور کے نام سے اَب تک اُن کے تین شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ مست ایک انجمن ساز بھی تھے۔ اُنھوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل ریاست جموں وکشمیر میں کئی ادبی انجمنوں کی بُنیاد ڈالی اور اس طرح وہ زندگی بھر شعر واَدب کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔

مست کاشمیری کا خاندانی نام دینا ناتھ چکن ہے۔ وہ ۱۹۰۲ء میں قصبہ اننت ناگ (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پنڈت آنند رام چکن مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ مست نے ابتدائی تعلیم اننت ناگ اور ویری ناگ کی درسگاہوں سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان سری نگر سے پاس کیا۔ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اُن کی مسلسل ناساز طبعیت رکاوٹ کا باعث بن گئی۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامی حالات نے مست کو شدید طور پر متاثر کیا۔ اننت ناگ کشمیر میں اُنھیں اپنے بزرگوں کی اِملاک چھوڑ کر دلّی کا رُخ کرنا پڑا اور پھر وہ دلّی میں ہی مستقل طور پر سکونت اختیار کرنے لگے۔ اپنی زندگی

---

[1] دینا ناتھ مست کاشمیری: الہاماتِ مست، ص ۸

کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے خود رقمطراز ہیں:۔

> ''میں اننت ناگ کشمیر میں پیدا ہوا تھا۔ میرا آبائی مکان آج بھی وہاں موجود ہے لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد کے بحرانی حالات سے مجبور ہو کر وہ مکان بیچنا پڑا۔ جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میری پرورش زیادہ تر جموں میں ہوئی۔ کچھ عرصہ ویری ناگ (بونہ گنڈ) میں اپنی ننھیال میں بھی رہا۔ وہاں کے اور اننت ناگ کے سکولوں میں بھی کچھ وقت گزرا۔ سری نگر میں زینہ دار محلہ حبہ کدل میں ہمارا مکان ہے۔ اس مکان میں طویل عرصے تک رہا ۱۹۵۰ء کے آخر میں دہلی آیا اور جب سے ملازمت کے سلسلے میں یہاں رہتا ہوں۔''[1]

مست وادیٔ کشمیر سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دِلّی کے ماحول اور اس کی فضاؤں میں رچ بس جانے کے باوجود بھی اپنے وطن کشمیر کو فراموش نہ کر سکے۔ اس کی رُوح پرور فضائیں اُنہیں بار بار دستک دیتی رہیں اور اُن کا لہو گرماتی رہیں۔ وہ کشمیر کے لازوال حُسن اور اس کی خوبصورتی سے عمر بھر دِل ہی دِل میں مسحور ہوتے رہے۔ جس کے نقوش اُن کے کلام میں جا بجا نظر آتے ہیں۔

مست کو کشمیر کے ذرے ذرے سے پیار تھا۔ وہ حُسن کے دیوانے تھے۔ اُن کے دِل میں کشمیر کے محنت کش عوام کے لئے درد تھا۔ اُنہیں جنگ و جدل سے نفرت تھی۔ وہ پیار محبت اور بھائی چارے کی جڑوں کو مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ اُنہیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ کشمیری ہیں۔ اپنی نظم ''اے مست وطن تیرا'' میں اُن کے کشمیر سے اسی والہانہ عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ ایک جگہ اُن تمام باتوں کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں:۔

کشمیر سی جنت ہے اے مست وطن تیرا
تقدیر تری کتنی فرخندہ و روشن ہے

مست کاشمیری صحافت سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اُس زمانے میں سری نگر سے اخبار شائع کرنے کی اس لئے زبردست کوشش کی تھی کہ کشمیر کی ثقافت، تہذیب، تمدن، کلچر اور اَدب کے بارے

---

[1] دینا ناتھ مست کاشمیری: فردوسِ خیال، ص ۹۴

میں لوگوں کو تازہ ترین معلومات فراہم ہوں۔ چونکہ ریاست میں اُس زمانے میں پریس کی آزادی نہیں تھی اور حکومتِ وقت نے اخبار شائع کرنے پر پابندی عاید کر دی تھی، اس لئے اُن کی یہ کوشش بار آور ثابت نہ ہو سکی۔ صحافت کا یہ جنون اُنہیں کشمیر سے لاہور کھینچ لایا۔ جہاں وہ پنڈت پچھمی نرائن کول کے اشتراک سے اخبار ''صبحِ کشمیر'' کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ یہ اخبار اُن کی مسلسل محنت، لگن اور مساعی سے خاص و عام میں مقبول ہوا۔ اِسی دوران جب ریاست جموں و کشمیر کے عوام کو پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی مل گئی اور اخبارات شائع کرنے کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ مست بھی لاہور سے سری نگر آئے اور یہاں کئی اخبارات سے منسلک ہو گئے۔ مست نے ریاست سے اخبار شائع کرنے کے لئے جو مساعی کی، صحافت کی کوئی بھی تاریخ اُن کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایک جگہ خود تحریر فرماتے ہیں:-

> ''آج جب کہ ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان اُردو ہے اور ریاست میں اُردو صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کی کثرت ہے۔ یہ اندازہ لگانا بہت ہی دشوار ہے کہ میرے اور میرے معاصرین کے اُس ابتدائی دور میں اُردو شعر و شاعری، ادب اور صحافت کے فروغ کے لئے کتنا اَنتھک کام کرنا پڑا ہوگا اور کسی صلے یا معاوضے کی تمنا یا اُمید کے بغیر مشنری جذبے کے ساتھ منہمک رہنا سچے خادموں ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔''[1]

مست کاشمیری سری نگر سے شائع ہونے والے اخبار ''مارتنڈ'' سے بھی منسلک رہے۔ یہ اخبار کشمیر پنڈتوں کی تنظیم ''یووک سبھا'' کا ترجمان تھا اور پنڈت کشپ بندھو کی ادارت میں نکلتا تھا۔ وہ ''ینگ کشمیر'' کی بھی ایک مدت تک ادارت کرتے رہے اور روزنامہ ''رہبر'' سے بھی وابستہ رہے۔ اپنی محنت، لگن اور صلاحیت سے اُنہوں نے ریاست کی صحافتی دُنیا میں ایک زمانے میں دھوم مچائی تھی۔ وہ ''نیا سنسار'' کی بھی ادارت کرتے رہے اور پھر ہفتہ روزہ ''البرق'' میں بھی شامل ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ تقسیمِ وطن کے بعد جب شیخ محمد عبداللہ نے ریاست جموں و کشمیر کی عنانِ حکومت سنبھالی تو اُن کے کہنے پر مست محکمہ اطلاعات و نشریات کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ وہ کچھ عرصہ کے لئے حکمران

---

[1] دینا ناتھ مست کاشمیری: فردوسِ خیال، ص ۱۱۵

پارٹی کے آفیشل اخبار روز نامہ ''خدمت'' میں بھی کام کرتے رہے اور اس طرح سے اُنہوں نے سالہا سال تک بحیثیت ایک اخبار نویس کے خدمات انجام دیں۔

مست نے وہ زمانہ دیکھا جب ترقی پسند تحریک اُبھری اور پروان چڑھی۔ اقبالؔ، جوشؔ، حفیظؔ، ساغرؔ، جوش ملسیانیؔ، مجازؔ، محرومؔ اور برج موہن دتاتریہ کیفیؔ کی شاعری عروج پر تھی۔ مست بھی ان شعرأ کے اثرات سے نہ بچ سکے، چنانچہ اُن کی شاعری میں ان تمام شعرأ کے اثرات بدرجہ اتم ملتے ہیں۔ قیامِ دِلّی کے دوران اُن کی ملاقات بعض معروف صحافیوں سے ہوئی۔ اُن کے مشورے سے مست امریکن رپورٹر کے ادارتی بورڈ میں شامل ہو گئے اور یہاں بھی اپنی محنت، لگن اور صلاحیت سے اپنے لئے انفرادی مقام بنایا۔ تقریباً بیس برس اس ادارے میں اپنے فرائض انجام دینے کے بعد وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

دینا ناتھ مست کاشمیری شروع سے ہی شعروشاعری سے شغف رکھتے تھے۔ سکول کے زمانے میں ہی اُنہوں نے مصرعے موزون کرنے شروع کئے تھے۔ چونکہ اُن کے والد سردیوں میں دربار کے ساتھ جموں آیا کرتے تھے۔ اِس لئے اُنہیں جموں کے شعرأ سے پہلے ہی رابطہ قایم ہو چکا تھا۔ جموں میں اُنہوں نے اپنے دُوسرے احباب کے ساتھ ''بزمِ اَدب'' قائم کی۔ اس بزم کے ساتھ وشوا ناتھ درماہ جموی اور قیس شیروانی جیسے شعرأ بھی وابستہ ہو گئے تھے۔ بزم کی طرف سے پابندی کے ساتھ مشاعرے اور ادبی تقاریب کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ مقامی شعرأ کے علاوہ ان تقاریب میں حفیظ جالندھری، تاجور نجیب آبادی، ساغر نظامی، احسان دانش، روش صدیقی، قمر جلال آبادی جیسے بڑے قد کے شعرأ بھی شامل ہوتے تھے۔ مست کے ہم عصر اور اپنے دور کے معروف شاعر اور محقق حبیب کیفوی (مرحوم) اپنی کتاب میں ریاست میں ادبی میدان ہموار بنانے اور اس کو ترقی و ترویج دینے میں مست کی پیہم مساعی کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> ''ریاست میں اُردو کے فروغ و ترقی کے لئے مست صاحب کی کوششیں قابلِ قدر ہیں۔ وہ بزم اُردو جموں و کشمیر کے پہلے صدر بھی چُنے گئے تھے۔ جس نے ریاست کے گرمائی اور سرمائی صدر مقاموں پر بڑے اہتمام سے سالانہ مشاعرے کر کے اہلِ جموں و کشمیر کو ہندوستان کے صفِ اوّل کے شاعروں سے متعارف کیا اور ان کا

کلام سنوایا۔"[۱]

سری نگر میں جب نمائش گاہ کا قیام عمل میں لایا گیا تو یہاں بھی مست کی کوششوں سے مشاعروں کا سلسلہ جاری رہا اور ۱۹۴۶ء تک اَدب نواز حضرات ان مجالس سے محظوظ ہوتے رہے۔ مست کا اوّلین شعری مجموعہ "فردوسِ خیال" کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں کشمیر جنّتِ بے نظیر، نیرنگِ فطرت، نغماتِ وطن، شخصیات اور رُوحانیت جیسے ذیلی عنوانات پر مشتمل اُن کی رنگا رنگ نظمیں شامل ہیں۔

"کشمیر جنتِ بے نظیر" کے ذیلی عنوان کے تحت "فردوسِ خیال" میں جو نظمیں ملتی ہیں اُن نظموں میں مست نے کشمیر کے مرغزاروں، آبشاروں، خوبصورت ندیوں اور جھرنوں، پھولوں اور پھلوں، چشموں اور باغوں، درختوں اور کھیتوں کی پوری پوری عکاسی کی ہے۔ یہ مست کے قلم کا اعجاز ہے کہ وہ مصوّر کی طرح تصویریں کھینچتے رہے اور کشمیر کے دِلفریب منظر آنکھوں کے سامنے لاتے رہے۔ نرم و نازک الفاظ میں کسی منظر کی مصوّری کرنا کتنا دُشوار کام ہے لیکن مست اپنے منصب میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اِن کی نظموں سے متعلق روزنامہ "ملاپ" کے چیف ایڈیٹر رنبیر جی بڑے پتے کی بات کہتے ہیں کہ "(مست نے) کشمیر پر جتنی نظمیں لکھی ہیں' اُن کا جواب نہیں۔ ہر نظم پڑھنے والے کو سراپا کشمیر بنا دیتی ہے۔"[۲]

"فردوسِ خیال" میں کشمیر کے موضوعات پر رنگا رنگ نظمیں ملتی ہیں' جو تاریخی بھی ہیں اور سیاسی بھی، سماجی بھی ہیں اور نیچرل بھی۔ کشمیر کی خوبصورتی پر بیسیوں شاعروں نے خامہ فرسائی کی ہے لیکن مست کا دعویٰ ہے کہ اِس موضوع پر جتنی نظمیں اُنہوں نے کہی ہیں' کسی دُوسرے شاعر نے نہیں کہی ہوں گی۔ چنانچہ ان باتوں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے خود ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> "جتنی نظمیں کشمیر کے مختلف موضوعات پر میں نے کہی ہیں ریاست یا ریاست سے باہر کے ہی نہیں بلکہ دُنیا کی کسی بھی زبان کے کسی بھی شاعر نے اتنی نظمیں نہیں کہی ہوں گی۔ اب آئندہ میری تقلید میں کوئی لکھے تو الگ بات ہے۔ اوّلیت کا سہرا

---

۱ حبیب کیفوی: کشمیر میں اُردو، ص ۵۰۱

۲ دینا ناتھ مست کاشمیری: فردوسِ خیال، ص ۲

میرے ہی سر رہے گا۔“[1]

کشمیر کے کلچر، تہذیب اور تمدن کے پس منظر میں مست کی نظمیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ نظمیں قاری کو سارے کشمیر کی سیر کراتی ہے اور اُنہیں غور وفکر کرنے کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ عرش ملسیانی کشمیر سے متعلق مست کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”کشمیر سے متعلق ایسا جامع مجموعۂ نظم میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ کشمیر کی ثقافتی، تاریخی، تمدنی اور قدرتی مناظر اور حُسن و خوبی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا ہے۔ بانیِ کشمیر (کشپ رشی) چل ڈل کی طرف لے چل‘ کیسر کی شہزادی‘ کاہ فروشہ‘ بار بار دیکھو‘ گل زمینِ وطن‘ لڑکپن کا جموں‘ دُنیا والی‘ اِک مدماتی‘ تجسُس وغیرہ بہت دِل آویز‘ سرمست اور وجدانیت بھری نظمیں ہیں۔“[2]

”فردوسِ خیال“ میں شامل بعض ایسی نظمیں بھی ہیں جن سے کشمیر کی تاریخ کے سنہری باب رقم کیے جا سکتے ہیں۔ مست نے ”بانیِ کشمیر“ کے عنوان سے ایک عمدہ نظم لکھی ہے۔ اس میں وہ کشمیر کی قدیم تاریخ دہراتے ہیں اور اس کے حقیقی بانی کشپ ریشی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ نظم کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:-

اے کشپ اے بانیِ خلدِ برینِ کاشمیر　　بخشی ہے تو نے ہمیں یہ گلزمین کاشمیر
بارِ احساں سے ترے سر ہم اُٹھا سکتے نہیں　　یہ وہ فرضِ دائمی ہے جو چکا سکتے نہیں
قابلِ صد داد ہے تیری نگاہِ انتخاب　　تو نے وہ خِطّہ چُنا جس کا نہیں کوئی جواب

آبِ حیواں سے بھری وادی کی وادی ڈھونڈ لی
عالمِ امکاں کی رنگیں شاہزادی ڈھونڈ لی

ہو گیا تھا خُلد سے محروم جو آدم کبھی　　کر دیا وہ خُلد اس کو پھر عطا اے مہرشی
تیرا ایما پا کے ریشیوں نے بسایا ہے اسے　　خونِ دِل سے اپنے سینچا ہے سجایا ہے اسے

---

[1] دینا ناتھ مست کاشمیری: فردوسِ خیال ص ۲۸

[2] ایضاً، ص ۱۱

بھاش ویدوں کے لکھے تشریح بھی تفسیر بھی فلسفے سے شِو کے بخشی خلق کو تنویر بھی
حق شناسی کی یہاں سے روشنی ملنے لگی ذہن وقلب و رُوح کو تابندگی ملنے لگی
واقفِ اسرار و رازِ ارضِ و افلاک و نجوم عِلم میں اُس وقت تک ہوتا نہ تھا کامل کوئی
جستجوئے علم میں آتے یہاں دُنیا کے لوگ چین کے ایران کے یونان کے روما کے لوگ

بودھ بھکشو بھی یہاں روشن دیا کرتے رہے
علمِ روحانی کی وہ اُرزاں ضیا کرتے رہے

مست کی ایک اور نظم ''بار بار دیکھ'' کا پس منظر بھی کشمیر ہے۔ اِس نظم میں وہ برف پوش پہاڑوں، سنسان جنگلوں، میٹھے چشموں، رنگ برنگے پھولوں، زعفران کے مسکراتے ہوئے کھیتوں، امبری سیبوں اور صاف وشفاف پانیوں سے بھری ہوئی جھیلوں کو موضوعِ بحث بناتے ہیں۔ نظم کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مست حقیقی معنوں میں کشمیر کے عاشق تھے۔ اُن کے رگ و ریشے میں کشمیر سمایا ہوا تھا۔ یہ نظم ایک یادگار نظم ہے اور جن لوگوں نے کشمیر نہیں دیکھا ہے وہ اِس نظم کے ذریعے سے کشمیر کی عطر بیز فضاؤں کا دِل ہی دِل میں نظارا کر سکتے ہیں۔ نظم کے ۱۳/ بند ہیں اور ہر ایک بند اقبالؔ کے اِس مصرع پر ختم ہوتا ہے۔

ع - ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

نظم کا ایک اِقتباس ملاحظہ کیجیے:-

یہ برف پوش کوہ یہ جنگل ہرے بھرے
رنگینیِ بہار اُفق سے بھی ہے پرے
حوروں کے جمگھٹے کہیں پریوں کے ہیں پرے
منظر قدم قدم پہ ہیں رُومانیت بھرے
ہمشکل دستِ پا میں برگِ چنار دیکھ
فردوسِ کاشمیر کا رنگِ بہار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

''صبحِ دہقان'' مست کی ایک اور عمدہ نظم ہے۔ اِس میں شاعر نے ویری ناگ (کشمیر) کی دیہی زِندگی کو موضوع بنایا ہے۔ مست کو اپنے بچپن کے خوش گوار لمحات ویری ناگ کی رُوح پرور فضاؤں میں گذارنے کا موقعہ مِلا۔ لہٰذا اُنہوں نے یہاں کے لوگوں کی زِندگی کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ بچپن کی یہ لطیف یادیں اُنہیں بار بار اُکساتی رہیں۔ ان جذبات کا اُنہوں نے ''صبحِ دہقان'' میں کُھل کر اظہار کیا ہے۔ مست شاعرِ مشرق اقبالؔ سے بے حد متاثر تھے۔ اُنہیں اقبالؔ کی نظم ''دانۂ گندم کو جلا دو'' اِس لئے عزیز تھی کہ یہ نظم مزدوروں اور غریب طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کی دھجیاں اُڑاتی ہے۔ ''صبحِ دہقان'' میں بھی مست کسان کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ نظم اُنہوں نے علاّمہ اقبالؔ کی خدمت میں اَرسال کی تھی۔ مست کے مطابق یہ نظم علاّمہ اقبال نے اس لئے پسند فرمائی تھی کہ اس میں مزدور کے دُکھ درد کی صحیح طور پر عکاسی کی گئی ہے۔ علامہ اقبال کے مطابق مزدور ہی دُنیا کے حقیقی معمار اور انسانیت کے صحیح علمبردار ہیں۔ ان باتوں کا اظہار کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

> ''یہ نظم ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ مرحوم کو ''دانۂ گندم کو جلا دو'' کے حوالے سے بھیجی گئی تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ نظم ہر لحاظ سے جامع اور بلند پایہ ہے۔ دہقان اور سڑک کے مزدور ہی ہمارے معمار اور محسن ہیں۔ اُن کی ترجمانی ضروری ہے۔ میرا میلان طبع اب اور طرف ہے یہ کام آپ لوگوں کا ہے۔''[1]

جھیل ڈل کشمیر کی ایک بہت ہی خوبصورت جھیل ہے۔ اِس کی لمبائی شمال سے جنوب کی طرف کوئی ساڑھے پانچ میل ہے اور چوڑائی مغرب سے مشرق کی طرف دو سے تین میل تک ہے۔ یہ صاف وشفاف پانیوں سے لبریز ایک بہت ہی خوبصورت جھیل ہے۔ شنکر آچاریہ کی پہاڑی کے دامن میں یہ جھیل سالہا سال سے دُور دُور سے آئے ہوئے سیاحوں کو دعوتِ نظارہ دیتی رہی ہے۔ دیکھئے مست اپنی نظم کے ذریعے سے اس خوبصورت جھیل کا لطف اُٹھانے کی دعوت کیسے دیتے ہیں۔ کشمیر کی اِس خوبصورت جھیل پر اُردو کے مختلف شعراء نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس جھیل کی خوبصورتی میں اپنے الفاظ سے چار چاند لگا دئے ہیں لیکن مست کا تخیل سب سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ نظم کا

---

[1] دینا ناتھ مست کاشمیری: فردوسِ خیال، ص ۳۹

ایک بند ملاحظہ کیجئے:-

چل ڈَل کی طرف لے چل　　جنت کا سماں دیکھیں
ہے قلبِ حزیں بے کل　　اِک تازہ جہاں دیکھیں
تشویش مٹے مَن کی
یہ رنج وستم بھولیں　　منظر وہ دِکھا ہم کو
اندوہ والم بھولیں　　مدہوش بنا ہم کو
اِک نشہ سا چھا جائے

''کیسر کی شہزادی'' اور ''زعفران کے یہ پھول'' مست کی دولازوال نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں مرقع کاری کے عمدہ نمونے پیش کرتی ہیں۔ کشمیر میں زعفران ایک محفوظ علاقے پانپور میں کثرت سے اُگتا ہے۔ کارتِک کی پورنماشی میں پانپور کے کھیت دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ اِس مہینے میں پانپور میں میلہ لگتا ہے اور دُور دراز دیہاتوں سے لوگ یہاں زعفران کا نظارہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔ لیجئے آپ بھی گھر بیٹھے زعفران کے کھیتوں کا نظارہ کیجئے:-

کیسر کی بھری کھیتی　　اُمید ہے دہقاں کی
نیلم کی بھری کھیتی　　تصویر ہے ارماں کی
جو پھول ہے پیارا ہے　　ہر آنکھ کا تارا ہے
کیسر کی بہار آئی　　کیسر کے چمن پھولے
خوش رنگ فضا چھائی　　خوشیوں کے پڑے جھولے
پانپور کی پریاں سب　　ہیں ناچتی گاتی اَب

اِس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیر اُردو شعراُ کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ یہاں کے پھولوں، پھلوں، آبشاروں، محلوں، کھیتوں، جھیلوں اور پربتوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے خوبصورت باغات پر بھی مختلف شعراُ نے خامہ فرسائی کی ہے۔ اقبال، چکبست، سرشار، جوش، حفیظ، منوّر لکھنوی، وامق جونپوری، شمیم کرہانی، شاذ تمکنت، اختر امرتسری اور اکبر جے پوری وغیرہ صرف چند نام ہیں۔ ان شعراُ نے کشمیر کے باغات کی رُوح پرور فضاؤں اور خوبصورت نظاروں سے متاثر ہو کر قابلِ قدر نظمیں لکھی ہیں۔ مست کشمیری

تھے، اس لئے اُنہوں نے کشمیر کے باغات کو کُھلی آنکھوں سے دیکھا تھا اور دِل کھول کر ان کی خوبصورتی کی داد دی ـــــ شالیمار باغ، نشاط باغ، چشمہ شاہی، نسیم باغ، ہاروَن وغیرہ صدیوں سے سیلانیوں کو دعوتِ نظارہ دیتے آئے ہیں۔ یہ باغات ایک الگ اور منفرد رنگ کے حامل ہیں۔ چشمہ شاہی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ایک بہت ہی خوبصورت باغ ہے۔ یہاں کا پانی آبِ حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ جب کہ شالیمار، نشاط باغ اور ہاروَن، پہاڑی کے دامن میں واقع نہایت ہی دِلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ مست نے اِن تمام باغات کی اپنی نظموں میں عکاسی کی ہے۔ اس کے علاوہ مست کی متعدد نظمیں ایسی ہیں جن سے کشمیر کی بھر پور تصویر سامنے آتی ہے۔ بار بار دیکھ، ملکۂ بہار، گلزمینِ وطن، مفہوم جنت، بانہال کی چوٹی پر، سرخیٔ بہار، بھٹکی ہرن، کنولوں کی بہار، سیبوں والی، خزان، پسِ خزان، بہارِ برف باری، کشمیر کا ایک دیہی منظر، میرے لڑکپن کا جموں، جموں سے کشمیر کا ایک سفر، اُتر بہنی، چہ ارزاں، بارش کے بعد، وغیرہ اُن کی قابلِ ذِکر نظمیں ہیں۔ ان نظموں سے نہ صرف کشمیر کی خوبصورتی ہی جھلکتی ہے بلکہ یہاں کے لوگوں کا رہن سہن، لباس، تہذیب اور کلچر کی بھی پوری پوری عکاسی ہوتی ہے۔ بقول پروفیسر جگن ناتھ آزاد:-

> ''مست نے کشمیر کے موضوع پر نظموں کا مینہہ برسا دیا۔ کشمیر کا حُسن ہو یا کشمیر کی تہذیب، کشمیر کا ماضی ہو یا کشمیر کا حال، اُس کی تاریخ ہو یا دیومالا، ان سب کو مست صاحب کی فکرِ رسا نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور اسے شعر کا دِلکش لباس پہنا کر اُردو شاعری کا ایک مستقبل باب بنا دیا ہے۔''[1]

''نغماتِ وطن'' کے ذیل میں وطن کے جذبات سے سرشار مست کی بعض اہم نظمیں ملتی ہیں۔ اِن نظموں میں وہ کبھی نیا کشمیر کا خواب دیکھتے ہیں اور کبھی آزادی کا جشن منانے کے خواہاں معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی وہ اپنا کارواں آگے بڑھانے میں مصروف نظر آتے ہیں اور برٹش راج کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں اور کبھی اِنتہائی مشکلات میں لوگوں کو اپنا عزم جواں رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مست نڈر سپاہی کی طرح ملک کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگانا چاہتے ہیں تا کہ وہ بھی ملک و قوم کی حفاظت کرنے کے لئے چاک و چوبند ہو جائیں۔ اُن کی نظم مکالمۂ جمہوریت ہو یا عزمِ جواں، جشنِ

---

[1] دیناناتھ مست کاشمیری: فردوسِ تخیل ص ۱۳

آزادی ہو یا نغمۂ اعظم' ضامنِ آزادی ہو یا نشاطِ حُریت' مست سچے دِل سے لوگوں کے جذبات کو اُبھارتے ہیں اور ملک وقوم کی ترقی کے لئے ہر دم کوشاں رہتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:-

گاندھی و نہرو کے پیچھے کارواں چلتا گیا
راہِ آزادی پہ کل ہندوستان چلتا گیا
سر بکف ہو کر ہر اِک خورد و کلاں چلتا گیا
جانب' دار و رسن ہر نوجواں چلتا گیا
بھول کر ہر بھارتی سود و زیاں چلتا گیا
بے نیازِ گردشِ وقت و زماں چلتا گیا
ایک دُنیا ساتھ ہولی جس طرف باغی بڑھے
ظُلم کے ایواں پہ سیلِ تُند ہو کر یہ چڑھے

(کارواں بڑھنے لگا)

''فردوسِ خیال'' میں شخصیات پر بھی بعض اہم اور دلآویز نظمیں ملتی ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مست ایک قوم پرست شاعر تھے۔ اُن کے رگ رگ میں قومی درد پایا جاتا ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں وطن کے نڈر سپاہی تھے۔ اُنہوں نے اپنی رُومانی شاعری کے ساتھ ساتھ دُنیا کی بعض اہم شخصیات کے کارناموں کو موضوع بنا کر اپنی نظموں میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ باپو، نہرو، ابوالکلام آزاد اور شیخ محمد عبداللہ پر اُنہوں نے بہت ہی خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ اِن نظموں میں اُنہوں نے ہندوستان کی اِن عظیم شخصیتوں کے کارناموں پر بحث کی ہے اور مُلک وقوم کے تیئں اُن کے سچے جذبے کا اظہار کیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو پر ''فردوسِ خیال'' میں ایک فکر انگیز نظم ملتی ہے۔ اس نظم میں نہرو کے تیئں مست کے گہرے جذبے کا اِظہار ملتا ہے۔ نظم کے آغاز میں مست لکھتے ہیں:-

''یکم جون ۱۹۴۰ء میں پنڈت جواہر لال جی نہرو کو یووک سبھا کشمیری پنڈتوں کی سیاسی تنظیم سری نگر کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ جلسہ شیتل ناتھ کے میدان میں ہوا۔ اُس تقریب کے لئے یہ نظم خاص طور پر لکھی گئی تھی، جو کم سے کم ایک لاکھ کے مجمع میں

پڑھی گئی۔''[1]

نظم کا ایک اِقتباس آپ بھی ملاحظہ کیجئے، جس میں شاعر پنڈت جواہر لال نہرو کو کشمیر کا حقیقی فرزند قرار دیتے ہیں:-

وطن کشمیر ہے اس کا یہ ہے آبائی کشمیری
کہ یہ خود میزبان ہے گو ہے بن کر مہمان آیا
رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے اس کی خون کشمیری
اسی ماں کا یہ بیٹا بن کے ہے فخرِ جہاں آیا
ہر آں کا گھر۔ ہے اس کے دِل میں اسکا گھر ہے ہر دِل میں
دِلوں کا تابع فرماں، دِلوں کا حکمراں آیا

مست نے رُوحانیت کے ذیلی عنوان کے تحت بھی بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں اُن کے دُوسرے موضوعات پر لکھی گئی نظموں کی طرح بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ماہِ عرب، رتھ بان، گرونانک دیو، روٹھ چلی اور نے نواز جیسی نظموں میں مست نے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی یعنی تمام مذاہب کے پیغمبروں کے تئیں اپنی والہانہ عقیدت کا اِظہار کیا ہے۔ دیکھئے نظم ''ماہِ عرب'' میں وہ پیغمبر اِسلامؐ کے تئیں کیسے سچے جذبے کا اظہار کرتے ہیں:-

گامزن مومن تھے پیغامِ رسول اللہؐ پر
جان فِدا کرنے لگے نامِ رسول اللہؐ پر
معتقد تھے لوگ اِسلامِ رسول اللہؐ پر
دارِ کُہنہ جگمگا اُٹھی نئی تنویر سے
بزمِ عالم گونج اُٹھی نعرۂ تکبیر سے

''رتھ بان'' مست کی طویل نظم ہے۔ یہ کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان ہوئی لڑائی کی داستان پیش کرتی ہے۔ یہ دراصل نیکی اور بدی کے درمیان جنگ ہے۔ جس میں سری کرشن مہاراج بدی، ناانصافی، ظلم اور حسد کا خاتمہ کرنے کے لئے برسرِ پیکار ہیں۔ وہ انصاف کے لئے لڑتے رہے اور ہمیشہ

---

[1] دینا ناتھ مست کاشمیری: فردوسِ خیال ص ۲۰۱

نیکی کا ساتھ دیتے رہے۔ مست نے ان تمام واقعات کو آسان اور عام فہم الفاظ میں جس طرح سے پیش کرنے کی سعی کی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ نظم کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:-

سمجھتا تھا تم مجھ سے اِنسان ہو
مُجھے علم کیا تھا کہ بھگوان ہو
نہ جانے میں کی ہوں گی گستاخیاں
ہزاروں ہوئی ہوں گی نادانیاں
ہوئی ہوں گی جو کچھ بھی سہو وخطا
میں رکھتا ہوں اُمید عفو و عطا
مرے دِل میں اَب پیش وپس کچھ نہیں
تمہارے سوا اس میں بس کچھ نہیں

یہ کہہ کر ہوا رَتھ پہ پھر وہ سوار
بڑا عزمِ نو سے پئے کارِزار
شری کرشن، ارجن کا رتھ بان تھا
نگہبان خود اُس کا بھگوان تھا

مست ''گورونانک دیوجی'' کے تیئں اپنے جذبے کا بھی اِظہار کرتے ہیں۔ اس میں بھی وہ نیکی، انصاف اور امن کی بات کرتے ہیں اور گورونانک جی کی تعلیمات پر عمل کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔

''الہاماتِ مست'' دینا ناتھ مست کاشمیری کا دُوسرا شعری مجموعہ ہے' جو غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مست کی یہ غزلیں غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں۔ مجموعے میں شامل غزلیں باعنوان ہیں۔ ہر ایک غزل کا عنوان مست نے غزل کے ردیف سے ہی اَخذ کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مست کا مطالعہ وسیع ہے۔ اُنہوں نے غالبؔ، داغؔ، اقبالؔ، حالیؔ، چکبستؔ کے ساتھ ساتھ جوشؔ، حفیظؔ، برج موہنؔ دتا تریہ کیفیؔ، آنند نرائن ملاؔ کا مطالعہ سنجیدگی سے کیا ہے۔ وہ برج موہن دتاتریہ کیفی اور جوش ملسیانی سے اکتسابِ فیض کر چکے ہیں۔ اسی لئے اُن کی غزلوں میں اُن تمام شعراُ کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں۔

مست کی غزلوں میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور فن کی نزاکتیں بھی۔ وہ شاعری کے فن سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اساتذۂ فن کا شروع سے ہی مطالعہ کر چکے تھے۔ اُنہوں نے مشاہدے اور مطالعے کی بھٹی میں اپنے آپ کو تپا کر کندن بنا دیا تھا۔ یہی اُن کے فکر وفن کی پہچان ہے۔ اُن کی غزلوں میں عشق و عاشقی کے جذبات بھی ملتے ہیں اور انسانی زندگی کے تجربات بھی، تصوف بھی اور سماجی مسائل کی کارفرمائی بھی۔ وہ ہر وقت نئے نئے مضامین کی تلاش میں رہتے ہیں اور اپنی شاعری کو ایک نئی سمت عطا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُردو کے معروف شاعر رفعت سروشؔ مست کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ''الہاماتِ مست'' کے سرنامے میں لکھتے ہیں:-

> ''اُن کی غزلوں میں زندگی کے تجربات بھی ملتے ہیں
> اور تصوّف و اخلاق کے مسائل بھی۔ مشقِ سخن نے اُن کے خیالات کو
> اور بھی جِلا دی ہے۔ غزلوں کے اس مجموعے کو بلا شبہ ایسا مجموعہ کہا جا
> سکتا ہے جسے اَدب کے طالب علموں، سخن فہم جوہر شناسوں کے لئے نظر
> انداز کرنا ممکن نہ ہوگا۔''[1]

مست کی غزلوں کا بنیادی موضوع عشق رہا ہے۔ وہ اس موضوع سے زِندگی کی گرہیں کھول دینا چاہتے ہیں اور حقائق دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق عشق اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ عشق کے راستے سے ہی زندگی کو تلاش کرنے کے حق میں ہیں۔ اُن کا عشق حقیقی ہے۔ اس میں کوئی فریب نہیں۔ اُن کے مطابق عشق نور بھی ہے اور نار بھی۔ وہ اقبال کے اس نظریئے کے قایل ہیں کہ انسان کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے عشق کا دامن تھام لینا چاہیے۔ وہ عشق کے ساتھ ساتھ حُسن کے بھی قایل تھے اور حُسن اور عشق کو لازم وملزوم قرار دیتے تھے۔ مثلاً:-

ے ہر مریضِ عشق کو جس آنکھ نے اچھا کیا — اُس نے میرے دِل میں درد لا دوا پیدا کیا
ے عشق میں ہوتا ہے نُقصان وزیاں ہی سود مند — ہم نے نُقصان وزیاں کا جان کر سودا کیا
ے اِن مجرمانِ عشق کی خود داریاں نہ پوچھ — عفو و کرم یہ اہل خطا مانگتے نہیں
ے دے رہی ہے عشق کی ہر بات درسِ اِنقلاب — ''انتہائے عشق نے مجنوں کو لیلا کر دیا''

---

[1] دینا ناتھ مست کا شمیری: الہاماتِ مست ص ۸

؎ مست حُسن وعشق دو جلوے ہیں اِک تنویر کے — یعنی دو رُخ ہیں مرے نزدیک اِک تصویر کے

؎ افسانے حُسن وعشق کے سنتے ہیں شوق سے — سُنتا نہیں ہے کوئی بھی اہلِ خُدا کی بات

؎ عشقِ بتاں میں اِتنا تو دِل کو ملا ہے فیض — سب فرقِ کفر و دیں کا فراموش ہو گیا

مست کی غزلوں میں جہاں ایک طرف انسانی زندگی کے حقائق کی ترجمانی ہوتی ہے وہاں وہ روایت کا مُنہ بھی نہیں موڑتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں روایتی شاعری کا بھرپور اثر ملتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نئے نئے مضامین کی تلاش میں بے چین رہتے ہیں۔ وہ روایتی الفاظ اور تراکیب کو اپنے خیالات سے نئے نئے مفاہیم عطا کرتے ہیں۔ اس طرح سے اُن کی غزلیں روایتی حد بندیوں سے آزاد ہو کر بھی روایت زدہ معلوم ہوتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

؎ کیا کیا نہ انتظار ہے تیرے ظہور کا — پیمانہ بھر رہا ہے دِلِ نا صبور کا

؎ حقیقت ذاتِ باری کی کہاں معلوم ہوتی ہے — نظر وابستہ وہم و گمان معلوم ہوتی ہے

؎ خُدا سے میں نہیں ڈرتا کہ وہ تو ہے کرم گُستر — میں ڈرتا ہوں ڈرتا ہوں فقط انسان کے شر سے

؎ آپ سے آپ کی شکایت کیا — آپ فرمائیں گے، عدالت کیا

؎ کچھ اس طرح گزری نہ گزری ہو جیسے — قیامت کی تھی آتی جاتی جوانی

؎ اب تو انسان ہی جاتے ہیں سرِ عرشِ بریں — عرش سے آتے کوئی صاحبِ اعجاز نہیں

؎ شعر گوئی مرا مذہب تو نہیں مست مگر — عارفانہ مرا اندازِ بیاں ہوتا ہے

مست کی غزلوں میں بھی اُن کا محبوب موضوع کشمیر اُبھر کے سامنے آیا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں کشمیر کے کلچر، تہذیب اور تمدن کی بات کرتے ہیں۔ اُن کا دِل کشمیر کی عطر بیز فضاؤں، ندی نالوں، دریاؤں اور آبشاروں اور سرسبز وشاداب میدانوں کے لئے مچلنے لگتا ہے۔ اُنہیں اِس بات کا عمر بھر صدمہ رہا کہ وہ کیوں کشمیر چھوڑ کر چلے گئے۔ اُنہیں کشمیر کے رنگ برنگے پھولوں سے پیار تھا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایّام کشمیر میں ہی گذارنا چاہتے تھے اور یہاں کے خوبصورت پرندوں کی چہچہاہٹ سے مسحور ہونا

چاہتے تھے۔ اُن کی غزلوں میں کشمیر کا رنگ کس حد تک اُبھرآیا ہے آپ بھی ملاحظہ کیجئے:-

ے پلا ہوں لالہ وگل میں وطن کشمیر ہے مرا مشام تر سے خوشبوئے گلستانی نہیں جاتی

ے کہاں دِلّی کی یہ محفل کہاں یہ مست کشمیری یہاں بھی یہ غزل کہتا ہے نادانی نہیں جاتی

ے میرا کشمیر ہے مرا کشمیر اور ہوتا ہے' باغِ جنت کیا

ے اے مست تُو ہے شاعرِ کشمیر بے نظیر باغ جناں کی تازگی تیرے سخن میں ہے

ے مست اپنے کیوں نہ ہوں رنگیں ہر ُومانی مزاج اُٹھے ہیں کشمیری جنت کی آب وگل سے ہم

ے یہی میرا وطن کشمیر رنگیں ارے ہے شیخ پھر باغ اِرم کیا

ے سخن میں تازگی کشمیر کی ہے گل افشاں مست ہے تیرا قلم کیا

مست کی غزلیں فن کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہیں۔ ان میں اگرچہ روایتی الفاظ' تراکیب اور علایم کی جھلکیاں اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نئے الفاظ وتراکیب اور تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس طرح سے وہ جدّت کے ساتھ ساتھ روایت کا بھی احترام رکھتے ہیں۔ اُن کی باعنوان غزلوں سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ جدّت کے قائل تھے۔ لیکن روایت کو ہرگز ہاتھ سے جانے دینے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی، ہندی اور عربی زبان کا گہرا اِدراک رکھتے تھے۔ اسی لئے اُن کے کلام میں اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی، ہندی اور عربی کے سُلجھے ہوئے الفاظ اور تراکیب ملتی ہیں۔ یہی اُن کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

مست نثر کے وسیلے سے بھی طبیعت آزما چکے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے دور کی قابلِ قدر شخصیات اور علمی وادبی تحریکات کے بارے میں بھی بعض اچھے مضامین لکھے ہیں' جن کی اہمیت سے اِنکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ''مضامینِ مست'' کے نام سے اُن کے منتخب مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے' جس کا تجزیہ کسی اور مقالے میں کیا جائے گا۔

کشمیر کا ایک بھولا بسرا ادیب اور سماجی کارکن

ـــــــــ شام لال ایمہ

ریاست جموں وکشمیر کے نامی گرامی قلمکاروں کے ساتھ ساتھ بعض ایسے قلمکاروں کی فہرست بھی سامنے آتی ہے جنہوں نے اُردو زبان واَدب کی ترقی وترویج میں اپنا بھرپور حصہ ادا کیا، لیکن زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے اُن کے کارناموں کو وقت کے دبیز پردوں میں چھپالیا۔ اُن قلمکاروں میں وشواناتھ درماہ جموی، دیناناتھ مٹوولگیر، تاراچند ترسل سالک، زنار دھن ٹینگ ساغر، شام لال ولی تیرتھ کاشمیری، دیناناتھ واریکو شاہد کاشمیری، نندلال کول بے غرض، گنگا دھر بٹ دیہاتی، ویرو یشیشور، دیا کرشن گردش اور جیالال بھان برق کاشمیری وغیرہ کی خدمات کو کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پنڈت شیام لال کول ایمہ کا نام بھی ایسے ہی قلمکاروں کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے جنہوں نے بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں اپنی محنت، لگن اور صلاحیت سے اپنے قلم کا جادو جگایا اور نثر ونظم یعنی اَدب کے دونوں شعبوں میں طبیعت آزمائی۔ اُردو زبان واَدب کے تئیں اُن کی خدمات اور کیا ہوسکتی ہیں کہ اُن کے خاندان کی کئی پُشتیں تادمِ تحریر اِس روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ پنڈت جی اُردو اور کشمیری زبان کے معروف کہانی کار اور ادیب ڈاکٹر برج پریمی کے والدِ بزرگوار اور راقم السطور کے دادا جان تھے۔

پنڈت شیامؔ لال کول ایمہ ۱۸۹۹ء[1] میں محلہ درابی یار، حبہ کدل سری نگر کے ایک تعلیم یافتہ کشمیری پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پنڈت شدھر کول اپنے زمانے کے ایک قابل مدرّس تسلیم کیئے جاتے تھے۔ پنڈت شیامؔ لال ایمہ نے مشن اسکول سری نگر سے میٹرک کا اِمتحان پاس کیا، جہاں اُن کے ہم جماعتی پنڈت نند لال کول طالبؔ کاشمیری تھے۔[2] ابھی اُنہوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالج کا رُخ بھی نہ کیا تھا کہ اُن کے والد اچانک اِنتقال کر گئے۔ گھر میں اَفلاس اور ناداری کے سائے منڈلانے لگے۔ اُنہیں تعلیم کو خیر باد کہہ کر مدرّسی کا پیشہ اِختیار کرنا پڑا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے پڑھنے لکھنے کا شغل بھی برقرار رکھا اور ادیب کامل، ادیب فاضل اور منشی کے اِمتحانات بھی پاس کیئے۔ اُنہیں کھیل کود سے بھی گہری دِلچسپی تھی۔ میڈم مونٹی صوری کی تربیت گاہ میں بھی اُنہوں نے تربیت حاصل کی تھی اور یہ اِمتحانات بھی اِمتیاز سے پاس کیئے تھے۔[3] علاّمہ علائی (مرحوم) جو اُس زمانے میں روزنامہ ''مارتنڈ'' سری نگر میں ریاست جموں و کشمیر کی ممتاز ادبی شخصیتوں پر ''شخصیات الادب'' کے نام سے مسلسل کالم لکھتے تھے، نے پنڈت شیامؔ لال ایمہ کا شخصی خاکہ کھینچا ہے۔ اُس خاکے سے موصوف کی شخصیت کا ایک بھرپور تاثر سامنے آ جاتا ہے۔ وہ اپنے اِس محبوب کالم میں رقمطراز ہیں:-

> ''نام پنڈت شیامؔ لال، ذات ایمہ، تخلص ابھی غور طلب ہے۔ ہنس مکھ ہیں خوبصورت ہیں، جوان ہیں، زندہ دِل ہیں، محنت کش ہیں اور بھی بہت کچھ ہیں.........لیکن ادیب ضرور ہیں۔ منشی کا اِمتحان دے چکے ہیں۔ اِسی لئے اپنے نام کے ساتھ منشی پریم چند کی طرح منشی شیامؔ لال ایمہ لکھتے ہیں.........''[4]

پنڈت شیامؔ لال ایمہ خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے دور کے ایک قابل مدرّس بھی تھے۔ اِس مقدس پیشے کا وہ دِل و جان سے احترام کرتے تھے اور اپنے اصول و ضوابط پر پابندی سے عمل کرتے تھے۔ اپنی محنت، لگن اور بے پناہ صلاحیت سے اُنہوں نے محکمہ تعلیم کے اَفسران کا دِل جیت لیا تھا۔

---

۱ پنڈت شیام لال کول ایمہ کی پیدائش کے بارے میں کوئی مصدقہ شہادت نہیں۔ البتہ وہ پروفیسر نند لال کول طالبؔ کاشمیری (پ-۱۸۹۹ء) کے ہم جماعتی تھے۔ اِس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ اُن کی تاریخ پیدائش بھی اسی سنہ کے آس پاس ہوگی۔

۲ ڈاکٹر برج پریمیؔ: ذوقِ نظر، ص ۱۴۴

۳ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم)، کشمیر میں اُردو (دُوسرا حصہ)، ص ۴۵۲

۴ روزنامہ ''مارتنڈ'' سری نگر، ۱۴ر ماگھ ۱۹۹۴

اِسی لئے اُس وقت کے ناظم تعلیمات اور معروف ادیب و دانشور خواجہ غلام السیدین اُنہیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ریاست میں جدید تعلیمی ڈھانچہ مرتب کرنے کے لئے اِحیائے نو ہوا تو سری نگر میں بھی ایک ماڈل اسکول قایم کیا گیا۔ چنانچہ پنڈت شیام لال ایمہ کی صلاحیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے محکمہ نے ماڈل اسکول سری نگر میں اُن کی خدمات طلب کیں، جہاں سالہا سال تک وہ نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرایض انجام دیتے رہے۔ اُنہوں نے کئی درسی کتب بھی لکھی تھیں، جو اُس زمانے میں بچوں کے نصاب میں شامل تھیں۔ اُن کتابوں کو تیار کرنے میں اُنہیں نندلال کول طالبؔ، پریم ناتھ بزازؔ، پریم ناتھ پردیسیؔ، دینا ناتھ وار یکو شاہدؔ کاشمیری اور غلام حیدر چشتی جیسے مشاہیرِ اَدب کا تعاون حاصل تھا۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی غیر مطبوعہ ڈائیری میں اِس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

> "......... کبھی کبھی شاموں کو والد کے دوستوں کی محفل یہاں لگتی تھی۔ یہیں اِسی کمرے میں' میں نے نندلال کول طالبؔ، پریم ناتھ بزازؔ، پریم ناتھ پردیسیؔ، دینا ناتھ وار یکو شاہدؔ کاشمیری اور دُوسرے معروف لوگوں کو دیکھا ہے۔ یہ سب والد کے دوست تھے، معروف ادیب اور شاعر تھے اور والد کے ساتھ اُس زمانے میں درسی کتابیں تیار کرتے تھے"۔ [۲]

پنڈت شیام لال ایمہ اسکاؤٹینگ کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اُنہوں نے اِس کی تربیت حاصل کی تھی اور یہ فرائض بھی وہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ برسوں تک بطورِ احسن انجام دیتے رہے۔ وہ بچوں کے ساتھ ساتھ خود بھی وردی میں لیس ہو کر میدان میں اُتر جاتے تھے اور اسکاؤٹینگ کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ماڈل اسکول میں وہ نہ صرف بچوں کو ہی بلکہ اساتذہ کو بھی بیسک ایجوکیشن کی تربیت دیتے رہے۔ اُن کا خیال تھا کہ تعلیم جدید اصول وضوابط اپنا کر بروئے کار لانی چاہئے اور اِس کے لئے نئے نئے میزان

---

۱ ہمارے نوتعمیر مکان واقع آزاد بستی، نئی پورہ سری نگر کشمیر میں والد کی ذاتی لائبریری میں ان میں سے بیشتر کتابیں اور قلمی نسخے موجود تھے۔ لیکن افسوس کہ ۱۹۹۰ء میں کشمیر میں دہشت گردی کی وجہ سے ہمیں لاکھوں لوگوں کے ساتھ نقل مکانی کر کے جموں آنا پڑا تو پیچھے سے ہمارے مکان کو شدید نقصان پہنچایا گیا اور ہماری تمام جائداد اور کتابیں لُوٹ لی گئیں۔

۲ والدِ مرحوم جناب ڈاکٹر برج پریمی کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق سے

بنانے چاہئیں۔ عصرِ حاضر کی تعلیم اُنہی اُصولوں کی ماحصل ہے۔ پنڈت جی سچے معنوں میں بچوں کی نفسیات سے واقف تھے۔۔ بچوں کو کھیل کود کے ذریعے سے تعلیم دینے میں وہ ماہر تھے۔ اُن کے طریقۂ تعلیم سے نہ صرف ریاست سے بلکہ بیرونِ ریاست سے بھی ممتاز ماہرینِ تعلیم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ حتیٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے رُوبرو ماڈل اسکول سری نگر میں کھیل کود کے ذریعے سے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا فخر بھی اُن ہی کو حاصل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حصولِ آزادی سے دوچار سال قبل پنڈت جی اپنے خاندان کے دُوسرے افراد کے ساتھ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے اپنا آبائی مکان چھوڑ کر سُسرالی مکان واقع رنگہ ٹینگ، عالی کدل، سری نگر منتقل ہوئے اور وہیں رہائش کرنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد اُن پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اِس بیماری سے وہ کئی سال تک لڑتے رہے۔ پنڈت جی ناساز طبیعت کی وجہ سے اپنے کنبہ کے ہمراہ اپنے آبائی مکان واقع درابی یار منتقل نہ ہو سکے۔[1] نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی عارضی قیام گاہ رنگہ ٹینگ، عالی کدل اُن کی مستقل مستقر بن گئی اور آخر ۱۹۴۹ء میں صرف ۵۰ برس کی عمر میں وہ اِس دُنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کے اِنتقالِ پُرملال پر نہ صرف ریاستی محکمہ تعلیم نے رنج و غم کا اِظہار کیا بلکہ ریاست کی مختلف علمی و اَدبی اور سماجی تنظیموں اور ثقافتی اِداروں نے بھی گہرے دُکھ کا اِظہار کیا۔ پنڈت جی کے بے وقت اِنتقال پر اُن کے ایک لنگوٹیے یار اور اپنے دور کے منفرد قلمکار آنجہانی دینا ناتھ واریکو شاہدؔ کاشمیری نے ''آہ! پنڈت شیاؔم لال ایمہ'' کے عنوان سے اپنے گہرے صدمے کا اِظہار یوں کیا:-

> ''آہ! یہ پنڈت شیاؔم لال ایمہ تھے، جو آج ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوئے عنفوانِ جوانی میں اور اپنے احباب اور اقارب کو داغِ مفارقت دے کر۔ تقریباً ڈیڑھ سال پیشتر فالج کا عارضہ لاحق ہوا جس سے جسمانی حالت کلیتاً بگڑ گئی۔ گو اِدھر اُدھر جاتے پھرتے تھے بحالت کمزوری اور بصورت مجبوری۔ بسیار کوشش کے باوجود صحت بحال نہ ہو سکی اور آخر اِسی حالت میں زندگی کا سفر ختم

---

[1] یہ مکان سالہا سال تک خالی پڑا رہنے سے لاپرواہی کا شکار ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی چھت ٹپکنے لگی اور در و بام ہلنے لگے اور پھر مونسپل کمیٹی کے اراکین نے اس مکان کو سرے سے ہی گرا کر پنڈت جی کے لواحقین کے ساتھ بہت بہت ناانصافی کی۔ زمین پر لوگوں نے ناجائز قبضہ کر لیا۔ (پ۔ر)

کرنا پڑا.....''[۱]

پنڈت شیام لال ایمہ متنوع دِلچسپیوں کے مالک تھے۔ پرماتما اُنہیں کروٹ کروٹ سورگ عطا کرے۔ اگر وہ تھوڑی دیر اور زندہ رہتے تو اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر کے اُردو اَدب کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرتے۔ اُنہوں نے گلگت کا سفر نامہ بھی لکھا تھا، افسوس جو اُن کی جوانمرگی اور لاپروائی سے تلف ہوا۔ پنڈت جی شروع سے ہی لکھنے پڑھنے سے شغف رکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ بچپن سے ہی پنڈت نندلال کول طالب کاشمیری کی صحبت میں رہ کر خود بھی شعر گوئی سے دِلچسپی ہوئی تھی۔ نثر نگاری میں بھی وہ کمال رکھتے تھے اور شروع سے ہی مختلف اَخبارات و جرائد میں دِلچسپ مضامین اور افسانے لکھتے تھے۔ نثر میں وہ منشی پریم چند، سرسید احمد خان، سدرشن اور خواجہ غلام السیدین سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ غالب، حالی، اقبال، چکبست اور اسمٰعیل میرٹھی اُن کے پسندیدہ شعراُ میں سے تھے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم اپنی کتاب میں پنڈت جی کی ادبی صلاحیتوں کا اِعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> ''......ایمہ نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں اور اُن کے اکثر مضامین مذہبی موضوعات یا تہواروں پر ہیں۔ مثلاً نوراترا اور بھگوان رام، شری رام چندر جی کے چرنوں میں، جیون مکت سدرشن وغیرہ۔ نورہ سے خطاب، میں سرسید احمد خان کے ایک مضمون کی طرح تمنائیں نئے سال سے وابستہ کی ہیں......''[۲]

شیام لال ایمہ کے اَدب کا بیشتر حصہ روزنامہ ''مارتنڈ'' سری نگر، ''رتن'' جموں، اور ''پھول'' لاہور جیسے رسائل و جرائد کے پُرانے شماروں میں محفوظ ہے۔ وہ بیک وقت ایک شاعر بھی تھے، افسانہ نگار بھی اور انشاپرداز بھی۔ مضمون نگاری سے بھی اُنہیں گہری دِلچسپی تھی۔ آپ شاعر کشمیر مہجور کاشمیری، پریم ناتھ بزاز، ماسٹر زندہ کول ثابت، کشپ بندھو، پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ واریکو شاہد کاشمیری، نندلال کول طالب کاشمیری، جیالال کول ناظر، فاضل کاشمیری، میر غلام رسول نازکی وغیرہ کے ہم عصر اور اُن کے حلقۂ احباب

---

[۱] روزنامہ ''مارتنڈ''، سری نگر کشمیر، ۳-۲ہاڑ ۲۰۰۶ بہ مطابق ۶ر جولائی ۱۹۴۹ء

[۲] پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) کشمیر میں اردو [illegible]

سے تعلق رکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی کا پاکیزہ مذاق رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک سماجی کارکن بھی تھے اور اَدبی وثقافتی اور سماجی سرگرمیوں میں پابندی کے ساتھ حصہ لیا کرتے تھے۔

شاعری میں وہ ''شیامؔ'' تخلص کرتے تھے اور طالبؔ کاشمیری سے وقتاً فوقتاً مشورہ لیا کرتے تھے، جو اُن کے ہم پیالہ وہم نوالہ تھے۔ شعر واَدب سے گہرا شغف ہونے کی وجہ سے خود طالبؔ صاحب بھی اپنے اِس دوست سے کافی متاثر تھے۔ وہ خود اپنا کلام سب سے پہلے پنڈت جی کو ہی سنایا کرتے تھے اور اِس پر اُن کی رائے حاصل کرتے تھے۔ جس کا ذکر بطورِ خاص طالبؔ مرحوم نے اپنے شعری مجموعے ''رشحات التخئیل'' میں کیا ہے۔[1] راقم السطور نے بڑی عرق ریزی سے پنڈت جی کے کلام کے تھوڑے سے حصّے کو اِکٹھا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اِس کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری میں روایتی عنصر غالب ہے۔ محبوب، عاشق، وصل، ہجر، بادہ، پیمانہ، رِند اور ساقی اُن کے خاص موضوعات رہے ہیں، لیکن ان موضوعات کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے دُنیا کی بے ثباتی، اِنسان کا کرب اور زوال پذیر قدروں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی عکاسی تو اِبتدأ سے ہی اُن کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ پنڈت جی بنیادی طور پر عشقیہ شاعر تھے۔ اِس لئے اُن کی شاعری میں عشقیہ مضامین کی جھلکیاں اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:-

اے کریما! شاہِ کشمیر روز وشب دِلشاد ہو
بارگاہِ ایزدی میں نت نئی فریاد ہو

روز افزوں ہو ترقی' اِس کی عمر دراز ہو
چشمِ دُشمن اَبتری میں برہم و برباد ہو

تیری رحمت ہو ہمیشہ اس کے سر پر سائبان
اس کے گفتار میں ہمیشہ مُنصفی اور داد ہو

یہ دُعا شام و سحر ہووے قبولِ بارگاہ
اس کی رعایا میں سدا با یکدیگر اِتحاد ہو

(۱۹/اکتوبر ۱۹۱۵ء)

---

[1] رشحاتِ التخئیل: پنڈت نند لال کول طالبؔ کاشمیری کا اوّلین مجموعہ کلام ہے۔

دِل لے کے گیا تو قاتل مجھے چھوڑ دیا ہے بسمل
نہیں ہو گیا تُو واصل مجھے چھوڑ دیا ہے بسمل
یارو وصال تیرا پاکر ہو جائیں رخصت
اَرماں یہی ہے دردِل مجھے چھوڑ دیا ہے بسمل
نالوں سے میرے ظالم چرخِ بلند پر بھی
تارے ہوئے ہیں گھائل مجھے چھوڑ دیا ہے بسمل

(۱۵رنومبر ۱۹۱۵ء)

کسی معشوق کم سِن پر طبیعت آنے والی ہے
دلِ پروردہ عشرت پر مصیبت آنے والی ہے
اِرادہ اُن کا ہے محفل میں بے پردہ نکلنے کا
قیامت ہے، قیامت میں قیامت آنے والی ہے۔

عاشق کو بے قرار تم رکھتے ہو کس طرح
سیماب رکھ کے ہاتھ میں بتلا دیا کہ یوں
کس طرح ایک چاند کے ہالے بنے ہیں دو
کانوں میں بالے ڈال کے بتلا دیا کہ یوں

دشتِ دِل سے مثلِ بارہ کے فراری چھوڑ دے
اور بیگانوں سے ملنے کی تیاری چھوڑ دے

دور کر دِل سے ہمارے سرد مہری یک قلم
سمجھ کر مجھ کو یگانہ فکر ساری چھوڑ دے

خواہشِ وصلت کی خاطر ہوں تڑپتا دَمبدم
غیر کی خاطر تڑپ کر اِنتظاری چھوڑ دے

ہجرتِ جاناں میں ہر دم رو رہا ہوں زار زار
چھوڑ کر مجھ کو تُو سب اُمیدواری چھوڑ دے

جان کا میری اگر اے یار کچھ بھی پاس ہے
کھیلنا دِل کو میرے مثلِ مداری چھوڑ دے

میں ہوں خورشید اور تُو چاند کی مانند پھرے
وَصل کی شب کو تو ، یہ سیاری چھوڑ دے

اے صنم پھر کر قبول یہ اِلتجائے شؔام ہے
تا صباح واصل تو ہوجا یہ مکاری چھوڑ دے

(۱۰؍جون ۱۹۱۶ء)

اِس دِل پہ ہائے میرا گر اِختیار ہوتا
کیوں مضطرب یہ رہتا کیوں بے قرار ہوتا

نالوں میں کیا نصیحت بنتی ہے راشت ناصح
وہ چارہ ساز ہوتا وہ غمگسار ہوتا

اُلجھا ہوا ہے یہ دِل زُلفوں میں اُس پری کے
پھر یوں جنوں نہ سر پر میرے سوار ہوتا

ہوتا نہ اُن کے رُخ پر گر نور کبریائی
کب عاشقوں کے دِل میں اُن کا وقار ہوتا

ماتھے پہ مری آکر ٹھوکر اگر لگاتا
غافل میں سو رہا تھا بس ہوشیار ہوتا

شیام لال ایمہ کے افسانے بھی قابل مطالعہ ہیں۔ اگر چہ اُن کے بہت کم افسانے دستیاب ہیں، لیکن اِن افسانوں میں افسانہ نگاری کے تمام لوازمات بہ درجہ اُتم ملتے ہیں۔ پلاٹ سازی، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری نے اُن کے افسانوں میں تسلسل پیدا کیا ہے۔ پنڈت جی افسانہ نگاری میں منشی پریم چند سے زبردست متاثر تھے۔ اُنہیں پریم چند سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ خود بھی منشی شیام لال ایمہ کے نام سے لکھنے لگے۔ اُنہوں نے پریم چند کے نظریات اور اُن کے خیالات سے آگہی حاصل کی تھی۔ اِسی لئے وہ اپنے افسانوں میں غریب طبقے کی نمائندگی کرتے رہے۔ اُن کے افسانوں میں زندہ وجاوید کردار نظر آتے ہیں اور یہ کردار اِن افسانوں کو حرکت دیتے ہیں اور اِن میں توازن اور اعتدال پیدا کرتے ہیں۔

پنڈت جی کا افسانہ "غربت" کے نام سے روزنامہ "مارتنڈ" سری نگر کے شِوراتری نمبر میں ۲۸ر فروری ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا۔ یہ افسانہ جاٹ مل، بینک بابو، راموں اور للتا جیسے کرداروں پر محیط ایک بہت ہی دلچسپ افسانہ ہے۔ جس میں ایک ایسی عورت کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جو حُسن و جمال کا پیکر ہے لیکن مفلسی اور لاچاری نے اُسے لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھنے، جھاڑو دینے اور کپڑے دھونے کا دھندا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ کہانی اُس وقت ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے جب ایک بینک بابو اُس کے دامِ حُسن میں گرفتار ہوتا ہے اور اُسے اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتا ہے۔ لیکن للتا ایک نیک سیرت، پتی ورتا، اور بااخلاق عورت ہے، جو کسی لالچ میں آکر اپنا جسم فروخت نہیں کرتی، بلکہ غربت کو ہی اپنا مقدر سمجھتی ہے اور اپنی عزت پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ افسانے کے تمام کردار متحرک ہیں۔ مکالمے برجستہ اور فکر انگیز ہیں اور فضا آفرینی افسانے کی شان اور نزاکت کو دوبالا کرتی ہے۔ مثلاً افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے پنڈت جی کے زورِ قلم، اُن کے فن میں حلاوت، اُن کی کردار نگاری اور پلاٹ سازی کے فن کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:-

> "......بینک بابو، جاٹ مل، راموں پر مہربان تھا۔
> للتا، بابو کے مکان پر جھاڑو دینے آیا کرتی تھی۔ اِتفاقاً ایک دِن بابو کی
> حریص نگاہیں اُس کے چکاچوند کرنے والے حسین چہرہ پر پڑیں اور
> اُسے بے تاب کردیا۔ کئی روز اُس نے تڑپتے تڑپتے گزارے۔
> آخر اُس کی برداشت کا جام لبریز ہوگیا اور دِل مشکوک۔ پتی ورتا اور

سادگی کی مجسمہ للتا، بابو کی ترچھی نگاہوں کا مطلب نہ سمجھ سکتی تھی۔ کیونکہ غریبوں کی نگاہوں میں امیر لوگ نہایت شریف اور خلیق ہوا کرتے ہیں۔ اُنہیں معلوم نہیں ہوتا کہ اُن کے اِخلاق کا دیوالہ تو شروع ہی سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ کئی روز بابو نے تڑپا تڑپی میں گزارے۔ آخر ایک دِن کسی بہانے سے بیوی میکے بھیج دی۔ للتا حسبِ معمول گھر میں جھاڑو دینے آئی۔ اُس کے دیکھتے ہی بابو سیماب وار مضطرب ہو کر مسکراتے ہوئے بولے......''[1]

''غربت'' کے بعد پنڈت جی کے بہت سے افسانے مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے، جن میں ''عیار ڈاکو''، ''لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا''، ''تختہ دار پر لٹکائے جانے کے بعد پھر زندہ ہو گیا'' وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔[2] لیکن افسوس کہ یہ افسانے تلاش بسیار کے باوجود بھی تادمِ تحریر ہاتھ میں نہ آ سکے۔ بلکہ مارتنڈ، رتن، بہارِ کشمیر، اور پھول، جیسے اُس دور کے مؤقر اَخبارات و جرائد کے اوراق میں دفن ہیں۔ تاہم پھر بھی اِن افسانوں کی تلاش جاری ہے۔

پنڈت شیاؔم لال ایمہ نثر نگاری کے میدان میں بھی اپنا سِکّہ جما چکے تھے۔ جس کا اندازہ اُردو اور کشمیری زبان کے معروف شاعر جناب پیتا مبر ناتھ در فانؔی کاشمیری کے اِس اقتباس سے ہوتا ہے۔ میرے ایک اِستفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:-

''.......آپ کے داداجان پنڈت شیاؔم لال ایمہ کے بارے میں اِتنا کچھ یاد ہے کہ اُن کے افسانے اور مقالات ''مارتنڈ'' میں وقت وقت پر چھپتے رہتے تھے۔ خاص کر اس کے شوراتری اور نوراترا (نورہ) کے ایڈیشنوں میں ایمہ صاحب کا ضرور کوئی نہ کوئی مضمون منظر عام پر آتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ میں سری پرتاپ کالج سری نگر کا ایک طالب علم تھا اور اُسی زمانے میں ''مارتنڈ'' میں میری چند ایک نظمیں معرضِ اشاعت میں آئیں۔ ایمہ

۱۔ روزنامہ ''مارتنڈ'' سری نگر، جلد ۶، نمبر ۲۴۲، (شوراتری ایڈیشن)

۲۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، ''کشمیر میں اُردو'' (دوسرا حصّہ) ص ۴۵۳

صاحب ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔" [1]

"نورہ سے خطاب" اُن کا ایک اہم مضمون ہے۔ جس میں وہ نورہ یعنی "نئے سال کی آمد" پر جشن منانے کی تلقین کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لوگوں کو نفرت، بغض، کدورت اور تعصب ترک کر کے ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے سینہ سپر ہونا چاہئے۔ اُن کے مطابق اگرچہ لوگ گذرے ہوئے برسوں میں غفلت شعاری سے کام لیتے رہے لیکن "نورہ" کے آتے آتے اُنہیں عہد کرنا چاہئے کہ وہ برائیوں کا ازالہ کریں۔ اُنہیں ایک لائحہ عمل متعین کرنا چاہئے اور قومی دھارے میں شامل ہو کر ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایک جگہ اس مضمون میں لکھتے ہیں:-

> "....اے ہماری ترقی کے راہنما! ہم نے تیرا پیغام سُنا اور حقیقی معنوں میں اِس کو سمجھ لیا۔ ہم نے گذشتہ گناہوں کا توبہ کر لیا اور ایسے کاموں کے کرنے سے اجتناب کا وعدہ کیا جو ہماری قومی مفاد کے خلاف ہوں۔ تیری آمد ہمارے واسطے اب مبارک ہو اور ہمیں توفیق عطا ہو کہ ہم تیرے مقصد کو سمجھ لیں۔ اپنے مستقبل کو روشن بنائیں۔ تمام مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور امن و شانتی کے ساتھ اپنے دِن بسر کریں۔ باعزت زندگی گذاریں۔ تیرا آنا ہماری قوم اور ہمارے محبوب والئے مُلک کے واسطے مبارک ہو....." [2]

پنڈت جی کا ایک اور مضمون قابلِ مطالعہ ہے۔ اُس میں وہ بھگوان رام سے اپنی گہری عقیدت کا اِظہار کرتے ہیں اور نوراترا کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کس طرح بھگوان رام نوراترا کے دِنوں میں ظلم و تشدد، جفا اور ریا کاری کا خاتمہ کرنے کے لئے دُنیا میں آئے اور اپنی کرنوں سے دُنیا کے کونے کونے کو منوّر کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ بھگوان رام نے خود بہت ساری مشکلات کا سامنا کیا۔ اُنہیں بن باس جانا پڑا اور تب وہ اپنی منزلِ مقصود کو پانے میں کامیاب ہوئے۔ اُنہوں نے ہر ایک کو یہی درس دیا کہ محنت، لگن اور صداقت سے ہی اِنسان کو شانتی مل سکتی ہے۔ اِن تمام باتوں کا اِظہار کرتے ہوئے وہ

---

[1] جناب پیتامبر ناتھ درفانی کاشمیری کے ایک خط کا اقتباس

[2] روزنامہ "مارتنڈ" سری نگر، جلد ۷، نمبر ۱۰۹، ۱۰ اپریل ۱۹۳۸ء، ص ۶۸

اپنے مضمون ''نوراترا اور بھگوان رام'' میں رقمطراز ہیں:-

''یہی نورہ کا دِن تھا۔ جس دِن بھگتوں کی آنکھیں اُس آتمک شکتی کی راہیں تک رہی تھیں۔ جس نے سنسار میں اَدھرم کا ناش کرنا تھا۔ یہی نوراترا تھا۔ جس دِن سے سنساری لوگ اُس میاں تیج کو دیکھنے کے لئے منتظر تھے، جس نے ظلم وتشدد کو ملیا میٹ کر دینا تھا۔'' [۱]

اِس مضمون کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:-

''پیارے دوستو! نوجوانو! پوجیہ بزرگو! ہندو قوم کی زندگی شری رام، شری کرشن کے پوتر ناموں کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی دھن ہے کوئی خزینہ ہے تو یہی پوتر نام ہیں۔ دیکھنا اِن پوتر ناموں کو اپنے دِل کے مندر سے نہ نکالنا۔'' [۲]

پنڈت شیاؔم لال ایمہ بچپن سے ہی اَدب کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اِس دِلچسپی کو اُجاگر کرنے میں اُن کے دوست اور ہمعصر پنڈت تاراچند بُلبُلؔ اَلمعروف کشپ بندھو کا زبردست ہاتھ تھا۔ پنڈت شیاؔم لال ایمہ پہلے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے سناتن دھرم یووک سبھا میں شامل ہوگئے اور بعد میں کشپ بندھو کے ساتھ نیشنل کانفرنس کی رُکنیت قبول کی اور اِس طرح سے دمِ واپسیں تک عوام کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ وہ نیشنل کانفرنس کے بنیادی اراکین میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن اِس نڈر اور بیباک انسان، قوم کے رضا کار خادم اور عوام کے نبض شناس کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ آج پنڈت شیاؔم لال ایمہ کو کوئی نہیں جانتا ہے۔ جن کے بارے میں پنڈت دینا ناتھ وار یکو شاہدؔ کاشمیری نے ایک زمانے میں لکھا تھا۔

''خوش کلام اور خوش سیرت نوجوان، قوم کا رضا کار خادم اور مُلک کا وفادار سپاہی، قومی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش

---

۱ روزنامہ ''مارتنڈ'' سری نگر، جلد ۷، نمبر ۱، ۹ر اپریل ۱۹۳۸ء، ص ۶۸

۲ روزنامہ ''مارتنڈ'' سری نگر، جلد ۷، نمبر ۱، ۹ر اپریل ۱۹۳۸ء، ص ۶۸

اور خدمتِ ملک کے لئے ہر وقت کمر بستہ، دِماغ قومی ترقی کے امور کے لئے حساس اور دِل قومی درد اور تڑپ سے معمور۔ قومی جلسہ ہو تو اہتمام کے لئے سب سے پہلے حاضر۔ جلوس ہو تو اِنتظام کے لئے پہلا آدمی موجود۔ ایک تنظیم کا دِلدادہ اور قوم کی یک جہتی کا آرزومند۔ قومی پروگرام کو نافذ العمل کرنے کے لئے پُر جوش کارکن اور تنظیم کی ہدایات کامیاب بنانے میں سرگرمِ عمل۔ رہنماؤں کا منظورِ نظر اور عوام کا منظورِ قلب —— آہ! یہ پنڈت شیام لال جی ایمہ تھے جو آج ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوئے۔"[1]

پنڈت جی قوم کی بھلائی کے لئے ہر دم کوشاں رہتے تھے۔ اُن میں تعصب اور تنگ نظری نام کی کوئی چیز نہیں تھی بلکہ وہ ہر مذہب کے لوگوں کی عزت کرتے تھے۔ قومی کاموں اور تہواروں میں بھی وہ پیش پیش رہتے تھے۔ بھگوان رام اور کرشن جی سے اُنہیں گہری عقیدت تھی۔ جنم اشٹمی کے دِن جھانکیاں سجانا اور جلوس میں نمایاں طور پر حصہ لینا اُنہوں نے اپنا شعار بنایا تھا۔ علّامہ علائی (مرحوم) پنڈت جی کے اِن اوصاف کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے اپنے محبوب کالم شخصیات الادب میں رقمطراز ہیں:-

"......قومی کاموں میں خوب حصّہ لیتے ہیں۔ علّامہ دِلگیر کی طرح جلسہ گاہوں میں سب سے پہلے پہونچتے ہیں اور جلوسوں میں بھی آگے آگے گاتے ہیں۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ دِلگیر صاحب پیدل چلتے ہیں اور ایمہ صاحب تانگہ سوار......"[2]

پنڈت جی زندہ دِل انسان تھے۔ اُن کی باتوں سے شگفتگی ٹپکتی تھی۔ اُن کی طبیعت میں زبردست روانی پائی جاتی تھی۔ یہی روانی اور معنی آفرینی اُن کی تحریر کی جان ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتے تھے، اُس کو اپنے خیالات سے فکر انگیز بنا دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ اُردو زبان و اَدب کے اُن خاموش خدمت گذاروں میں سے تھے جن کے اَدبی اور عِلمی کارنامے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

---

1. روزنامہ "مارتنڈ"، سری نگر کشمیر، ۳-۲ ہاڑ ۲۰۰۶ مطابق ۶ رجولائی ۱۹۴۹ء

2. روزنامہ "مارتنڈ"، سری نگر، نمبر ۱۴، ۱۴ر ماگھ ۱۹۹۶

گیت ــــــــ

ہماری تہذیب کے آئینہ دار

گیت ہندی شاعری کی دین ہے۔ اُردو شاعری میں جس طرح کی گداختگی، خوب صورتی، نرماہٹ اور شیرینی کا احساس غزل میں ہوتا ہے' گیت ایسی ہی چند خصوصیات کا حامل ہے۔ اُردو میں گیت نگاری کا آغاز کہاں، کیسے اور کب ہوا؟ یہ ہماری بحث سے اِس وقت خارج ہے۔ اَلبتہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اُردو میں گیت ہندی کے اثر سے آیا۔ بعض لوگ اُردو گیت کے ڈانڈے ولؔی سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک مختلف شاعروں کے کلام سے ملاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو میں پہلی بار گیت کے واضح نقوش امیر خسرؔو کی شاعری میں ملتے ہیں۔ اُن کا یہ دوہا ملاحظہ کیجئے جس میں گیت کی لوچ ملتی ہے۔ کہتے ہیں:-

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس

امیر خسرو کے بعد قلی قطب شاؔہ، وجہؔی، غواصؔی، ولؔی، نظیؔر وغیرہ کی شاعری میں گیت کی لوچ پائی جاتی ہے۔ میرا بائی نے ہندی گیتوں کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا۔ ان کے گیتوں میں کرشن بھکتی کا

نمایاں رَس ملتا ہے۔ سُورداس اور کبیر کے گیت بھی بہت ہی اہم درجہ رکھتے ہیں۔ ۱۹ ویں صدی میں امانت لکھنوی کے ڈراما ''اِندر سبھا'' میں بھی گیت ملتے ہیں۔ گیت نگاری کو فروغ دینے میں اسٹیج کا بھی کافی دخل رہا ہے۔ چنانچہ پارسی تھیٹریکل کمپنی کے وجود میں آنے سے غزل کے ساتھ ساتھ گیت بھی موسیقی میں ڈھل کر عام لوگوں تک پہنچ گئے۔ اُردو گیت نگاری کو فروغ دینے میں آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اگرچہ اُنہوں نے اپنے گیتوں میں حسن وعشق کی رنگارنگی بیان کی ہے لیکن اس دور کے تہذیب وتمدن کی جھلکیاں بھی ان گیتوں میں نمایاں طور پر دیکھنے میں آتی ہیں۔ بیسویں صدی میں عظمت اللہ خان، حفیظ جالندھری، میراجی، ساغر نظامی، مقبول احمد پوری، عبدالمجید بھٹی، قیوم نظر، قتیل شفائی، شکیل بدایونی، مسعود حسین خان، ساحرلدھیانوی، سلام مچھلی شہری، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، قمر جلال آبادی، حسرت جے پوری، بیکل اُتساہی، تاج سعید، مجید امجد، تنویر نقوی، اکرم افکار وغیرہ نے اِس صنف کو آگے بڑھایا۔ حالیہ برسوں میں زبیر رضوی، منیر نیازی، ناصر شہزاد، کرشن موہن، بمل کرشن اَشک اور ندا فاضلی وغیرہ نے بہت اچھے گیت لکھے اور اس کو ایک مستقل صنف بنانے کی کوشش کی۔

گیت ہماری تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ملک وقوم کی تہذیب اور ثقافت کو نمایاں کرنے میں اَدب کا زبردست ہاتھ ہوتا ہے۔ یوں تو زمانے کے درد وکرب کا اِظہار نثر ونظم دونوں صورتوں میں کیا جاتا ہے لیکن اَدب کی تمام اَصناف میں سے گیت ہی ایک ایسی صنف ہے جس کے ذریعے سے تہذیب وثقافت کی پوری پوری آئینہ داری ہوتی ہے۔ گیت عام طور پر لوک گیتوں کی لَے کے اُٹھان کے قریب ہوتے ہیں۔ ان میں ہندو دیومالا اور اساطیر کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

گیت میں نہ صرف صدیوں پرانے چہروں کی نقاب کشائی ہوتی ہے بلکہ ہمارا ماضی، ہمارا کلچر، ہماری تہذیب وتمدّن اِنہی گیتوں کے ذریعہ سے اُجاگر ہوتے ہیں۔ گیتوں میں ہماری سماجی بدعتوں کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور ساس بہو کے جھگڑے کی مرقع کاری بھی۔ قحط سالی، سیلاب کی تباہ کاری، آتشزدگی کی وارداتوں کے ساتھ ساتھ اِنسان پر صدیوں سے ٹوٹے مصائب کی آئینہ داری بھی گیتوں کے ذریعہ سے اچھے اور مؤثر طریقے سے ہوتی ہے۔

اُردو گیت کو ترقی وترویج دینے میں عظمت اللہ خان، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور میراجی کے

کارہائے نمایاں کوکوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔ان کے گیت اُردو کی جدید گیت نگاری کی تاریخ میں ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کے گیتوں میں وسیع اِمکانات ملتے ہیں۔ان کے گیتوں میں میراؔ کا اثر واضح طور پر ملتا ہے۔انہوں نے طرح طرح کے موضوعات کو گیت کے سانچے میں ڈھال دیا۔چند مثالیں:-

اپنے من میں پریت بسالے　　اپنے من میں پریت
من مندر میں پریت بسالے　　او مورکھ او بھولے بھالے
دِل کی دُنیا کر کے روشن　　اپنے گھر میں جوت جگالے
پریت ہے تیری ریت پرانی　　پریت ہے تیری ریت
(حفیظ جالندھری)

کبھی ہنسائے کبھی رُلائے　　بین بجا کر سب کو رِجھائے
اس کی ریت انوکھی نیاری　　جیون ایک مداری
(میراجی)

دُنیا میں اِنسان جینے کے لئے آتا ہے لیکن زندگی اس قدر پراگندہ ہوگئی ہے کہ چاروں اور اُلجھنیں محسوس ہو رہی ہیں۔اس مشینی دور میں ہر ایک اِنسان ذہنی پریشانی میں گرفتار ہے۔ایک طرف بے روزگاری کا مسئلہ اور دُوسری طرف اِنسان کے سر پر مہنگائی آن پڑی ہے۔رِشوت خوری کا بازار گرم ہے۔کثیر آبادی نے ہمارا سارا انظام درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ان مسائل سے دو چار لوگ اَب فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے ہیں۔قتیل شفائی نے اپنے اس گیت میں ان تمام باتوں کا احاطہ کیا ہے اور معاشرے پر طنز کے تیر چلائے ہیں۔کہتے ہیں:-

سب پھرتے ہیں گلی گلی اِس ظالم پیٹ کی خاطر　　اپنے اپنے مال کی بولی دیتی ہے سب دُنیا
کوئی بیچے کاٹھ کا اُلو کوئی کھانڈ کی چڑیا　　بھوکوں کی بارات چلی اس ظالم پیٹ کی خاطر
سب پھرتے ہیں گلی گلی اِس ظالم پیٹ کی خاطر

تلک لگا کر پھرے نجومی پیٹ کی آگ بُجھانے کو　　سب کے دِل کا حال بتائے اپنا حال نہ جانے
بن گئے جھوٹے لوگ ولی اِس ظالم پیٹ کی خاطر　　سب پھرتے ہیں گلی گلی اِس ظالم پیٹ کی خاطر

ایک اور طنزیہ گیت ملاحظہ فرمائیے جس میں کہا گیا ہے کہ آج کل کا اِنسان لالچی بن گیا ہے۔ ہوس کی آگ نے اسے ایسا ناگ بنا دیا ہے جس کے منہ سے شعلے نکل رہے ہیں اور وہ ان شعلوں سے دُنیا میں بدامنی کا زہر پھیلا رہا ہے۔ دیکھئے اشک امرتسری نے اپنے اس گیت میں اس بات کو کیسے انوکھے ڈھنگ سے بیان کیا ہے:-

حرص و ہوس کی رقاصہ نے موت کا چھیڑا راگ　　راگ کہ جس کی تال پہ ناچیں جنگلی کالے ناگ
ناگ کے سم ہیں جن کے تن میں اور دہن میں آگ　　آگ کہ جس سے بھڑکیں شعلے اُٹھے من میں ہوک
کوک ری کوئل کوک

وامق جونپوری نے بنگال کے قحط پر ایک اچھا گیت لکھا ہے۔ اس گیت میں اُنہوں نے ان تمام لوگوں کی ترجمانی کی ہے جو اس زبردست آشوب کا شکار ہو گئے ہیں۔ وامق ان لوگوں کے لئے خون کے آنسو بہا رہے ہیں اور ان کے حق میں دعائیں مانگ رہے ہیں۔

کوٹھریوں میں گانجے بیٹھے بنئے سارا اناج　　سُندر ناری بھوک کی ماری بیچے گھر گھر لاج
چوپٹ نگری کون سنبھالے چار طرف بھونچال　　رے ساتھی چار طرف بھونچال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

قحط بنگال پر کافی نظمیں اور گیت لکھے گئے ہیں لیکن وامق کے اس گیت میں شدت پائی جاتی ہے۔ گیت نے بھی نظم کی طرح عشق و محبت، ہجر و وصال اور زُلف و رُخسار کے حدود سے نکل کر دُنیاوی مسائل کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ جس کی عمدہ مثال مجید امجد کا یہ گیت ہے جس میں کرکٹ کے شائقین کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے، کہتے ہیں:-

کھڑی ہیں منتظر حسین لڑکیاں　　کھلاڑیوں کے خود نوشت دستخط کے واسطے
بیاض آرزو بکف

حبیب تنویر اپنے اس گیت میں طنز کے تیر چلاتے ہیں۔ کہتے ہیں:-

دوست اگر بتلاؤں دل کی بات　　بری بات ہے سامراج کی گھات
تھپکی دے کر پیٹ پہ مارے لات　　پیٹھ میں خنجر بھونکے
لہو پئے پی کر اترائے　　جنگ نہ ہونے پائے

شادی بیاہ اِنسانی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ یہ ایک ایسا سماجی اور تہذیبی بندھن ہے جس کے بغیر اِنسان نامکمل ہے۔ اِس بندھن کو رونق بخشنے والا اور اس کو مؤثر و مستحکم بنانے والا گیت ہی ہے۔ شادی بیاہ کے مختلف موقعوں پر بھی مختلف رسومات نبھانے کے لئے گیتوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ منگنی کی رسم نبھانے میں دُوسری تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ گیت بھی اہم رول اَدا کرتے ہیں۔

مہندی رات کے گیت بھی بڑے دِلچسپ ہوتے ہیں۔ ان گیتوں کے ذریعہ سے دُلہن کو ذہنی طور پر سسرال جانے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ ساس، سسر، خاوند، نند اور دیگر افراد کے تئیں اِظہار محبت کا دَرس بھی اِنہی گیتوں سے دیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ گیتوں کے ذریعہ سے گھریلو کام کاج، گرہست پالنے اور اَزدواجی زندگی آرام و سکون سے گذارنے کے طور طریقے بھی سمجھائے جاتے ہیں۔ صدیوں سے آئی ہوئی (پرم پرا) روایت نہ صرف دُلہن کو گیتوں کے ذریعہ سے گوش گذار کی جاتی ہے بلکہ اس کے ساس، سسر، نند کو بھی دُلہن کے تئیں ان کے فرائض کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔

سہاگ کے گیت بارات آنے پر گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں دُلہن کی عرصہ دراز سے چھپی ہوئی تمنائیں اور آرزوئیں بسی ہوتی ہیں۔ بابُل کے گیت، اگر چہ شادی کے گیتوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں لیکن ان گیتوں میں الگ قسم کے جذبات پیش کئے جاتے ہیں۔ اس گیت میں شاعر نے بڑے خوبصورت انداز میں ان تمام باتوں کا احاطہ کیا ہے:-

——— خوشیوں کی رات آئی باج رہی شہنائی — بابُل کے دوار

گوری نے جیت لیا ساجن کا پیار

نگر نگر البیلی دُلہن کی دُھوم مچی — کہتی ہے پائل کی میٹھی جھنکار

گوری نے جیت لیا ساجن کا پیار

کاجل میں کجرائے نینوں کو رنگ ملا — جیون کو پنکھ لگے ساجن کا سنگ ملا

دھرتی سے اُڑ کے چلی امبر کے پار

گوری نے جیت لیا ساجن کا پیار ———

ہمارے سماج میں ساس سسر، نند بہو اور دیور کا رِشتہ کافی نازک رِشتہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس رشتہ میں اگر ہلکی سی خراش آجائے تو گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے شادی کے موقعہ پر جہیز ایک اہم مسئلہ بن

گیا ہے۔ اگر چہ زمانہ بدل گیا ہے لیکن لین دین کے معاملے میں لوگوں کا نظریہ کم وبیش وہی پرانا ہے۔ لڑکی والا اپنے آپ کو مظلوم سمجھ کر سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ صبر وضبط کے اس جذبہ کو ایثار کا درجہ دیا گیا ہے۔ بہو کا اصلی گھر تو اُس کا سسرال ہی ہوتا ہے۔ یہیں اس کا جینا اور مرنا ہے۔ کشمیر کے اس لوک گیت میں ان تمام باتوں کا احاطہ کیا گیا ہے:-

— صبح گھاٹ کی اور چلی

وہاں مجھے بابا ملا　　　مجھے گھر لے گیا
اور پھولوں کے بستر پر بٹھایا　　　ایک طرف طوطا رکھا
دُوسری جانب خود بیٹھا　　　میں نے حالِ دل بیان کیا
میری آنکھیں نم ہو گئیں　　　بابا یہ سب کچھ سنتا گیا
پھر بولا
بیٹا یہ سب سہنا ہوگا　　　مٹکے میں پانی لے جا
ساس سسر کے پاؤں دھو جا　　　یہی ہماری ریت ہے پیاری
اسی میں جیون کی ہے جیت ———

شادی بیاہ کے ان تمام گیتوں میں ہندوستانی تہذیب وتمدن اور کلچر کے گونا گوں پہلو سامنے آتے ہیں۔ پنگھٹ کے گیتوں میں دَرد و کسک کی بھرپور جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ دیکھئے اختر شیرانی نے اس گیت میں دیہات کی اس خوبصورت اور بھولی بھالی لڑکی کی کس طرح مرقع کاری کی ہے۔ جو کندھے پر گگریا لے کر پنگھٹ پر پانی بھرنے جاتی ہے:-

چاند سا مکھڑا بالی عمریا　　　دیکھنے والے بھولیں ڈگریا
نازک کندھا بھاری گگریا　　　پنگھٹ پر پنیا بھرن کو آئی........ پنہاری!

رُومانی گیتوں میں عشق ومحبت کے قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے گیتوں کا تعلق براہ راست ہماری تہذیبی زندگی کے ساتھ ہے۔ محبت ایک فطری شے ہے۔ عشق ومحبت کے قصے صدیوں سے مشہور ہیں۔ ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں اور سوہنی مہینوال کی عشقیہ داستانیں ہم صدیوں سے سنتے آئے ہیں۔ یہ قصے ہماری تہذیب کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان قصوں کو ہمارے گیت کاروں نے جس ڈھنگ سے اپنی

تخلیقات میں پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اس طرح کے گیت نما قصوں میں ہماری صدیوں سے چلی آرہی تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔ مسعود حسین خان کا یہ گیت دیکھئے، وہ کیسے آس لگائے بیٹھے ہیں:۔

—— جاؤ ستارو جاؤ، میرا سویرا لاؤ　　رات کے اس کالے آنچل میں
رتنوں کے اس شیش محل میں　　ڈھونڈ کے لاؤ مت شرماؤ
جاؤ ستارو جاؤ، میرا سویرا لاؤ ——

اَختر شیرانی کا یہ رُومانی گیت ملاحظہ کیجئے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے پیار کی خوشبو آتی ہے:۔

—— کھو جاتے تھے جب دونوں　　ہم پیار کی باتوں میں
ان چاندنی راتوں میں
مچلی ہوئی بانہوں میں　　پھیلے ہوئے ہاتھوں میں
لطف آتا تھا آہوں میں　　ان چاندنی راتوں میں ——

عشق گیت کاروں کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ اس موضوع پر بے شمار گیت تخلیق کئے جا چکے ہیں۔ بعض گیتوں میں رُومانس اور سیکس کی جھلکیاں کھل کر سامنے آتی ہیں اور بعض گیت ایسے ہیں جن میں نہ صرف عاشق اور محبوب کے شوخ جذبات کی نشاندہی ہوتی ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ آج کل کے سماج پر طنز بھی کرتے ہیں۔ درج ذیل گیتوں میں بے قراری بھی ہے اور شدت بھی، مثلاً:۔

—— اب کیا دیکھیں راہ تمہاری　　بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات
تھم گئے آنسو تھک گئیں آنکھیاں　　گزر گئی برسات
بیت چلی ہے رات　　چھوڑو غم کی بات ——

(فیض احمد فیض)

—— جیت لیا تورے گیت نے من کو　　آگ لگے مورے بالے پن کو
نینوں میں نہ آئے کوئی دُوجا　　کروں گی نس دن پریتم پوجا
بھجن تورے گاؤں گی بن کے پُجارن　　جوگن بن جاؤں گی سیاں تورے کارن ——

(میرا جی)

تقسیمِ وطن کا اَلمیہ بھی اَدب کے مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ گیت کا موضوع رہا ہے۔اس تاریخی واقعہ میں کتنی ہی معصوم جوانیاں برباد ہو گئیں۔ کتنے بچے اناتھ ہو گئے۔ کتنوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ کتنے سہاگ لُٹ گئے۔ بربادی و قتل و غارت کی یہ داستان دُنیا کی تاریخ میں ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے۔اس گیت میں اجتماعی درد و کرب کو پیش کیا گیا ہے:-

——— کھیتی باڑی محل دو محلے سب کچھ ہو گیا راکھ

کھاتی پیتی دُنیا ہو گئی مفلس اور محتاج

آیا اپنا راج ———

قیوم نظر کے اس گیت میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے:-

زمیں نے لی کروٹ زمیں دیکھتے دیکھتے بٹ گئی

جہاں اک طرف آسماں اک طرف قفس اک طرف آشیاں اک طرف

ہوئے ایسے شیخ برہمن الگ رہے جیسے سرسوں سے ساون الگ

نئے سے نئے ظلم ڈھائے گئے قیامت کے جادو جگائے گئے

بعض دُوسرے گیتوں میں لوریاں، گھریلو گیت، سہرے، راہبانہ زندگی کے گیت، میلے ٹھیلے کے گیت، جلاپے کے گیت، مناظر قدرت کے گیت وغیرہ شامل ہیں۔ان تمام گیتوں میں ہماری تہذیب کی رُوح پوشیدہ ہے۔

گیتوں میں ہماری تاریخ کے کتنے ہی حقائق مضمر ہیں۔ بادشاہوں کے معاشقے، اِنسان کا رہن سہن، اس کا لباس، پرانے زیورات کے نام، قلعوں اور باغوں کا ذِکر اور سماجی زندگی میں رُونما ہوئے واقعات و حادثات کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ان میں سے بعض واقعات زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ دفن ہو چکے ہیں۔لیکن گیت ہی ایک ایسی صنف ہے جو تاریخ کے ان واقعات کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔

رسا جاودانی کے بعض اہم خطوط

رسا جاودانی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ایک منفرد انداز کے شاعر ہیں اور اپنے تخیل کی تازہ کاری سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں جہاں ایک طرف حُسن وعشق کا بانکپن ملتا ہے، وہاں وہ اپنی شاعری میں اِنسان کے درد وکرب کا بھی بڑے انوکھے انداز میں احاطہ کرتے ہیں۔ رسا نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اُس زمانے میں ریاست میں اُردو شعر وادب کے اُفق پر شعرأ کا ایک بڑا قافلہ رواں دواں تھا، جن میں نندلال کول طالب کاشمیری، شہ زور کاشمیری، منوہر لال دِل، کشن سمیلپوری، قیس شیروانی، تنہا انصاری، دنیا ناتھ مست کاشمیری اور میر غلام رسول نازکی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ لیکن رسا نے اپنی محنت، لگن اور مسلسل ریاضت سے بہت ہی قلیل مدّت میں اپنی پہچان منوائی اور اُن کا نام ریاست کے اہم شعرأ کی صف میں نمایاں طور پر لیا جانے لگا۔

رسا (مرحوم) نہ صرف ایک معتبر شاعر ہی تھے بلکہ اُنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے عزیز واقربا کے نام جو خطوط مرحمت کیے ہیں، اُن خطوط سے بھی اُن کی شخصیت اور شاعری کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں۔ یہاں راقم السطور کے نام رسا مرحوم کے چند خطوط کا ایک ہلکا سا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔ گو کہ یہ خطوط تعداد کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہیں لیکن پھر بھی رسا پر تحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

رساؔ (مرحوم) کے نام اور اُن کی شاعری سے میں بچپن سے ہی واقف تھا، لیکن جب اُن کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو اُن کی علمی و ادبی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آئے۔ میں اُن دِنوں ''ریاست جموں وکشمیر میں اُردو شاعری'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف تھا۔ اِس کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے جانفشانی سے کام کرنا شروع کیا تھا اور بڑی جگر کاوی اور مسلسل محنت اور لگن سے بہت سا مواد جمع کیا۔ اُسی دور میں اپنے کام کے سلسلے میں دینا ناتھ مستؔ کاشمیری، امرچند ولیؔ، شہہ زورؔ کاشمیری، شوریدہؔ کاشمیری، مبارک شاہ فطرتؔ، میر غلام رسول نازکیؔ، مرزا کمال الدین شیداؔ، مولانا مسعودیؔ، جیالال بھان برقؔ، قیصر قلندرؔ، پیتامبر ناتھ درفانیؔ، عبدالحق برقؔ، عرشؔ صہبائی، اکبر جے پوری، حکیم منظورؔ، عابدؔ مناوری، حامدیؔ کاشمیری، سیفیؔ سوپوری وغیرہ مشاہیر شعرأ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جناب رساؔ کی شخصیت اور اُن کی شاعری پر اگرچہ مختلف جرائد و اخبارات میں وقتاً فوقتاً مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن یہ مضامین اُن کی برگزیدہ شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لئے ناکافی ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے کلام کا وافر حصہ اب تک بھی غیر مطبوعہ ہے جس میں اُن کی نعتیہ شاعری بھی شامل ہے۔ اِس طرح سے رساؔ پر کام کرنے والوں کے لئے دُشواری پیدا ہو رہی ہے۔ مجھے اپنی تحقیق کے دوران جہاں جہاں اُن کے فنی نِکات کو سمجھنے میں دُشواری محسوس ہوئی۔ میں نے اُن سے براہِ راست رجوع کیا۔ ایک اِستفسار کے جواب میں وہ مجھے لکھتے ہیں:-

> ''آپ کا نوازش نامہ شرفِ صدور لایا ہے۔ میں جموں گیا ہوا تھا۔ اَب پرسوں پھر جموں مشاعرے میں شمولیت کے لئے جا رہا ہوں۔ آپ کے سوالنامے کا جواب چار دِن کے بعد واپسی پر اَرسال کروں گا۔ آپ کی بڑی نوازش۔''

رساؔ جاودانی اِبتدا سے ہی شعر گوئی کا مذاق رکھتے تھے۔ گھر میں ادبی ماحول تھا۔ خود بھی اُردو اور فارسی زبان واَدب سے گہری دِلچسپی رکھتے تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ وہ بچپن سے ہی گانے بجانے سے بھی شغف رکھتے تھے۔ آگے چل کر اُن کے دِل میں عجیب قسم کی گداختگی پیدا ہوگئی اور اُس گداختگی اور تڑپ نے اُن کے اندر کا شاعر بیدار کیا۔ اپنی شاعری کے آغاز میں اُن کے قلم سے مہمل اور بے معنی اشعار پھوٹنے لگے۔ لیکن بعد میں باقاعدہ ریاضت سے اُن کی شاعری میں پختگی آگئی۔ میرے اِستفسار کے

جواب میں لکھتے ہیں:-

''بچپن سے گانے کا بہت رسیا تھا۔ شاعری کا شوق
بچپن سے تھا۔ سنِ بلوغ سے پہلے مہمل اور بے معنی اشعار کہتا تھا۔
ساتویں جماعت سے مستقل طور پر اُردو میں شعر کہنے لگا۔ فارسی خود سمجھتا
تھا۔ نظامی گنجوی کے اشعار

''لعلِ طراز کرِ آفتاب''

ایسے اشعار شوق سے گنگناتا تھا اور معنی سمجھتا
تھا.........''

رسا جاودانی کشمیری ہوتے ہوئے بھی اُردو زبان واَدب سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ جس کا بین ثبوت اُن کی نظم ''اُردو'' کا مطالعہ کرنے سے ملتا ہے۔ وہ اُردو کو عبادت کا درجہ دیتے تھے اور اِس کو مشترکہ تہذیب وتمدن اور کلچر کی زبان تصوّر کرتے تھے۔ اُن کے مطابق اِس زبان کی حفاظت کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ وہ فخریہ اَنداز میں کہتے تھے کہ اُردو زبان کو ہمارے ملک میں وہی درجہ حاصل ہے جو باقی تسلیم شدہ زبانوں کا ہے۔ اُن کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے بھی اِس بات کا بخوبی انداز ہوتا ہے کہ وہ اُردو زبان اور اَدب سے گہرا شغف رکھتے تھے، حالانکہ وہ کشمیری تھے۔ کشمیری ہی اُن کی مادری زبان تھی لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ اُنہوں نے کشمیری زبان واَدب کو فراموش کر دیا تھا، وہ کشمیری زبان کے بھی ایک بلند پایہ کے شاعر تھے۔ اُنہوں نے کشمیری زبان وادب کو اپنے سدا بہار نغموں سے وُسعت عطا کی۔ فارسی زبان واَدب سے بھی وہ گہری دِلچسپی رکھتے تھے اور اِس زبان کو اُردو اور کشمیری دونوں زبانوں کا منبع قرار دیتے تھے۔ چنانچہ اِن خیالات کا اِظہار کرتے ہوئے ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

''فارسی زبان نے کشمیری زبان کو بھی اُردو کی طرح
رعنائی اور بانکپن بخشا۔ ترکیبات، تلمیحات، اِستعارات اور تشبیہات
نے مالدار کر دیا۔ بھدّے اور بھونڈے اَلفاظ کی جگہ خوبصورت لطیف
لفظ کشمیری زبان کے جزوْ بن گئے۔ تخیل کو بلند پروازی عطا کی۔ لیکن
اَب اُردو دُشمنی کی وجہ سے رَجعت پسندی اِختیار کی جارہی ہے۔
تعصب کی وجہ سے کشمیری زبان خالص کیا ''نخالص'' بنائی جارہی

ہے۔ اِس کے متعلق میں نے ایک مقالہ لکھا ہے۔ اگر میں اِنشا اللہ
کشمیر آیا تو اپریل میں ضرور آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کروں گا
اور مضمون آپ کے مطالعے میں آئے گا۔ اُردو کا لسانی طور کشمیری پر
کچھ اثر نہیں پڑا۔ اُردُو خود فارسی سے سرمایہ دار ہے۔ مانگنے والے سے
کوئی کیا مانگے۔"

رسا جاودانی نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی تھے بلکہ وہ ایک خدا ترس بزرگ بھی تھے۔ نفاست پسندی، اِنکساری اور شرافت میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ اُن کی گفتار میں نرمی اور مزاج میں شگفتگی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی لئے وہ خاص وعام میں مقبول تھے۔ افسوس کہ بے پناہ کوششوں کے باوجود بھی میں اُس دور میں اُن کا نیاز حاصل نہ کر سکا۔ حالانکہ وہ مشاعروں اور اَدبی تقاریب میں حصّہ لینے کے لئے سری نگر تشریف لاتے رہے۔ ۲/ جولائی ۱۹۷۸ء کو وہ ایک ریڈیائی اور ٹی وی پروگرام میں شرکت کرنے کے لئے سری نگر تشریف لائے، لیکن اِس کی اِطلاع مجھے تاخیر سے ملی۔ اِس وجہ سے اُن سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا جس کا مجھے کافی افسوس ہے۔ ایک مختصر سے خط میں لکھتے ہیں:-

"میں سری نگر آیا لیکن آپ سے نہ مل سکا۔ جس کا
مجھے بہت افسوس ہے۔ اگرچہ ہر وقت دِل میں آپ کا خیال رہا، لیکن
حالات کچھ ایسے تھے کہ مجھے فرصت نہ ملی۔"

رسا (مرحوم) بہت ہی حسّاس طبیعت کے مالک تھے۔ وہ کسی کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ جب سری نگر میں اُن کی تشریف آوری کے باوجود میں اُن سے نیاز حاصل نہ کر سکا اور نہ ہی اُنہوں نے اپنے پروگرام سے قبل اَز وقت آگاہ کرنے کی زحمت کی تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ اُنہوں نے سری نگر میں اپنی مصروفیات کا حال کچھ اِس طرح بیان کیا کہ قائل ہونا پڑا۔ راقم السطور کے نام اُن کے اِس خط سے اُن کی مصروفیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں:-

"تفصیل اس سفر کی یہ ہے کہ ۱۳/ جون ۱۹۷۸ء کو
جناب سٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو کشمیر کی دعوت پر سری نگر پہنچا۔ ۱۴/ جون کو
میں شہر میں نہ آیا۔ ۱۵/ جون اور ۱۶/ جون کو دِن بھر ریڈیو سٹیشن پر رہا۔

کشمیری ریکارڈنگ کے وقت جناب اختر محی الدین، جناب
مرزا عارف بیگ صاحب، پرنسپل آر. این. کول صاحب اور جناب غلام
رسول نازکی صاحب رونقِ محفل رہے۔ اُردو ریکارڈنگ کے وقت محفل
میں خود جناب سٹیشن ڈائریکٹر تشریف فرما رہے۔ جناب قیصر قلندر،
جناب زبیر رضوی، جناب اوتار کرشن رہبر صاحب موجود تھے۔ ۱۷ر
جون کو بھی مصروف رہا۔ ۱۸ر جون کو واپس لوٹنا پڑا۔"

رسا (مرحوم) سرینگر کی اَدبی تقاریب میں اکثر رونقِ محفل ہوا کرتے تھے۔ ریڈیو کشمیر سری نگر سے اُن کی شخصیت اور فن پر متعدد پروگرام براڈ کاسٹ ہوئے اور اِس طرح سے اُن کی شاعری کے بارے میں تفصیلات فراہم ہوتی رہیں۔ اُس زمانے میں اُن کے شعری مجموعے "نظم ثریا" پر میرا تبصرہ ماہنامہ "دبستان" سری نگر میں شائع ہوا۔ میں نے اُن کی خدمت میں رسالے کی ایک جلد بذریعہ ڈاک اَرسال کی لیکن ڈاک کے ناقص نظام کی وجہ سے متذکرہ رسالہ اُن تک نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں مجھے رسالہ نہ ملنے کی شکایت یوں کرتے ہیں:-

"آپ کا نوازش نامہ کچھ دِنوں کا ملا ہوا ہے۔ آپ
نے میرے خط کا جواب مہینوں کے بعد دیا۔ آپ کی ارادت مندی کا
شکریہ!
میں ۱۵ر، ۱۶ر کو ریڈیو سٹیشن پر سارے سارے دِن
رہا۔ ۱۷ر جون کو بھی شام تک اپنے کرم فرماؤں سے ملنے کا وقت نہ ملا۔
۱۸ر جون کو صبح واپس روانہ ہوا۔ ہر چند میرا ہفتہ بھر سری نگر رہنے کا اِرادہ
اور پروگرام تھا۔ لیکن ۱۷ر شام کو سب پروگرام بدلنا پڑا۔
اگر پھر بشرطِ زندگی سری نگر آیا تو ضرور شرفِ ملاقات
حاصل کروں گا۔ مجھے آپ سے ملنے کا بہت اِشتیاق ہے۔
رسالہ "دبستان" کی کاپی ابھی نہیں ملی۔ مضمون کے
لئے شکریہ۔ اگر پوسٹل سرٹیفیکٹ کے تحت بھجوایں تو گم ہونے کا اندیشہ

نہ رہے گا۔"

رساؔ (مرحوم) ریاست جموں و کشمیر کے دُور افتادہ مقام بھدرواہ میں رہایش کرنے کے باوجود بھی برصغیر ہندوپاک میں اُردو کی صورتِ حال سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے تھے۔ اُن کے لئے جہاں غالبؔ، اقبالؔ، داغؔ، جوشؔ، حفیظؔ، سیمابؔ اور جگرؔ کے کلام کا بہ غائر مطالعہ کرنا عزیز تھا، وہاں وہ ریاست کے اُردو شعروادب کے منظرنامے پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ بھدرواہ سے تعلق رکھنے والے شعرأ سے اُنہیں بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ کامگارؔ، نشاطؔ، ڈُولوالؔ اور عشرتؔ کی شاعری کے وہ دِلدادہ تھے۔ خاص طور پر عشرتؔ سے اُنہیں گہرا لگاؤ تھا۔ مجھے ایک خط میں اُن کے بارے میں جانکاری فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"عشرتؔ مرحوم کشتواڑ کے رہنے والے تھے۔ ادیب ومورّخ تھے۔ تاریخ میں زیادہ دِلچسپی رکھتے تھے۔ اُردو میں کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ ایک اُردو اخبار کے ایڈیٹر بھی رہے۔ دہلی میں اوائل زندگی کے گیارہ سال گزارے۔ لب ولہجہ دہلی والوں کا سا تھا۔ پہلے اسکول ماسٹر رہے، پھر بی۔ڈی۔او- قانون سازیہ کے ممبر بھی رہے۔ اچھا مذاق پایا تھا۔ خدا مغفرت کرے۔"

رساؔ کو غزل گوئی سے فطری مناسبت تھی۔ اُن کی غزلوں میں اقبالؔ، دردؔ، تسیمؔ، مومنؔ، مصحفیؔ اور سرشارؔ کا رنگ بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔ رساؔ نے اپنے تخیل کی تازہ کاری اور اسلوب کے انوکھے پن سے اپنی غزلوں میں اگرچہ نئے رنگ بھر دیئے ہیں تاہم روایت سے کبھی کنارہ کشی نہیں کی۔ اُن کی بعض غزلیں چھوٹی بحور میں ملتی ہیں۔ اُن میں کہیں کہیں رُومانیت کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔ لیکن اَشعار تو ایسے ہیں جو بہت ہی خیال انگیز ہیں۔ رساؔ کی نظمیں بھی اُن کی غزلوں کی طرح نہایت ہی دِلکش و دِلگداز ہیں۔ ان میں بھی شدّت، معنویت، تاثیر اور پُرکاری پائی جاتی ہے۔ رساؔ صاحب جدیدیت سے نہ مرعوب ہیں اور نہ اِس کا اَثر قبول کرتے ہیں۔ اُن کی ایک الگ ہی دُنیا تھی۔ جس میں جدیدیت اور روایتی شاعری کا اِمتزاج ملتا ہے۔ البتہ جدیدیت کے بارے میں اُن کے نظریات واضح ہیں۔ ایک خط میں رقمطراز ہیں:۔

"اُردو میں کچھ لکھنے والوں نے فن سے فرار کر کے نظم میں جونئی ڈگر اختیار کی، وہ راستہ کشمیری شعرأ نے بھی اپنایا۔ جس کا نام

جدیدیت یا ترقی پسندی وغیرہ ہے۔ اِس سے زبان میں مواد کافی جمع ہو جائے گا۔ اگر لکھنے والا باشعور، سلیقہ مند شاعر ہو تو خوبصورت اور نفیس چیزیں بھی کشمیری زبان میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ میں اِس پر زیادہ کچھ لکھ کر جھگڑا مول نہیں لینا چاہتا ہوں۔''

رسؔا جاودانی کے خطوط سے بے پناہ خلوص جھلکتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں، رفیقوں اور شاگردوں کے ذاتی معاملات میں بھی زبردست دِل چسپی لیتے تھے۔ میری ایک غزل ماہنامہ ''شیرازہ'' سری نگر کے کسی شمارے میں چھپ کر اُن کی نظر سے گذری، تو اُنھوں نے اپنے ایک خط کے ذریعے سے مجھے اُس کے بارے میں اِطلاع دی اور اُس کو پسند فرمایا۔ یہ اُن کی عظمت کی ایک قابلِ قدر مثال ہے، لکھتے ہیں:-

''آپ کی غزلیں میں نے پڑھی تھیں............ آپ کی ایک غزل کہ نظم میں نے شیرازہ میں پڑھی۔ اُس کے بارے میں رائے زنی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ ....''

رسؔا جاودانی کا طرزِ تحریر بہت ہی دِلفریب ہے۔ وہ نہ شاعرانہ اسالیب کے قائل تھے اور نہ فلسفیانہ رنگ کے۔ وہ اپنے خطوط میں اکثر بے تکلفی سے کام لیتے تھے۔ فارسی، عربی اور اُردو کا اِتنا گہرا مطالعہ ہو کے بھی اُن کے خطوط روزمرہ کی زبان میں ملتے ہیں اور یہی اُن کے خطوط کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

میر غلام رسول نازکی کی شخصیت اور شاعری ___

میر غلام رسول نازکی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کا شمار نہ صرف کشمیری زبان کے مستند شعراُ میں ہوتا ہے بلکہ وہ اُردو کے ایک اہم شاعر اور دانشور کے طور پر بھی جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ نازکی صاحب اُردو اور کشمیری شاعری کے علاوہ فارسی شاعری میں بھی طبیعت آزما چکے ہیں اور اس طرح سے عمر بھر ان تینوں زبانوں کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ کشمیری زبان اُن کی مادری زبان تھی اور اس زبان کو اُنھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا، لیکن اُردو زبان سے اُنہیں فطری لگاؤ تھا اور اس میں اُن کے بے شمار شعری اور نثری نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ عربی زبان کا بھی گہرا اِدراک رکھتے تھے اور اس زبان میں بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔

میر غلام رسول نازکی ۱۹۱۰ء میں ایک معزز اور علم دوست مسلم گھرانے میں میر غلام مصطفےٰ نازکی کے ہاں پیدا ہوئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بانڈی پورہ میں پیدا ہوئے جو صحیح نہیں ہے۔ وہ اپنے ننھیال بمقام شہید میر (وٹلب) میں پیدا ہوئے۔ ہاں اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے بچپن میں ہی نامعلوم وجوہات کی بنا پر اُن کا خاندان سری نگر سے تقریباً ۱۲۰ کلومیٹر دور بانڈی پورہ منتقل ہوگیا۔ نازکی صاحب نے اسی دیہات میں اپنا بچپن گذارا۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی اور پھر ۱۹۲۵ء

میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی کا امتحان اچھے نمبرات لے کر پاس کیا۔ اسی زمانے میں اُن کے والد انتقال کر گئے لہذا مزید تعلیم حاصل کرنے کے دروازے اُن کے لئے بند ہو گئے۔ گھر میں افلاس اور ناداری کی وجہ سے وہ ۸/روپے ماہوار تنخواہ پر ریاستی محکمہ تعلیم میں مدرّس ہو گئے اور اُنہیں بانڈی پورہ سے تقریباً چالیس کلومیٹر دُور وڈی پورہ کے ایک پرائمری اسکول میں تعنیات کیا گیا' جہاں وہ تقریباً دو سال تک بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے رہے۔ چونکہ پڑھنے لکھنے سے اُنہیں شروع سے ہی دِلچسپی تھی اِس لئے ملازت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تعلیمی قابلیت میں بھی اِضافہ کرتے رہے۔ اُنہوں نے ادیب فاضل اور بی۔اے کے امتحانات بھی کامیاب کئے۔ اپنی زندگی کے بارے میں مزید جانکاری فراہم کرتے ہوئے میرے ایک اِستفسار کے جواب میں اُنہوں نے مُجھے بتایا:-

> ''پرائمری کلاس تک بانڈی پورہ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اسلامیہ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ اِسی دوران میرے والد کا اِنتقال ہوا تو تعلیم کو نامکمل چھوڑنا پڑا۔ مفلسی اور تنگ دستی نے میرا دامن پکڑ لیا۔ کتاب خریدنے کے لئے کوئی پیسہ نہیں تھا۔ کاپیوں کے بدلے اخباری کاغذات پر لکھا کرتا تھا۔ ساتویں جماعت میں منشی کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ ۲۶-۱۹۲۵ء میں ملازمت کا آغاز کیا۔ پڑھنے لکھنے سے زبردست دِلچسپی تھی۔ ادیب فاضل، مولوی فاضل اور بی۔اے کے امتحانات ملازمت کے ساتھ ساتھ پاس کئے۔''[۱]

بحثیت ایک اُستاد کے نازکی صاحب اپنے فرائض سالہا سال تک انجام دیتے رہے۔ اپنی محنت لگن اور قابلیت کی وجہ سے وہ ترقی کے مختلف زینے طے کرتے ہوئے اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے تک پہنچ گئے۔ اُس زمانے میں ریاستی محکمہ تعلیم کے ناظم مشہور ادیب اور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین تھے۔ نازکی صاحب کی شاعری، اُن کی علم دوستی اور اُن کی صلاحیت دیکھ کر خواجہ صاحب بھی اُن کے قایل ہو گئے اور اُنہیں ٹریننگ اسکول کی طرف سے شائع ہونے والے جریدے ''تعلیم جدید'' کا مدیر مقرر کیا گیا۔ یہاں بھی نازکی صاحب اپنی محنت اور قابلیت سے اپنا سکہ جمانے میں کامیاب ہوئے اور بقول

۱۔ میر غلام رسول نازکی صاحب کے ساتھ ایک یادگار ملاقات

ڈاکٹر برج پریمی' اس رسالے نے یہاں کے تعلیمی معیار کو بڑھانے میں خاص رول ادا کیا۔ اپنے ایک مضمون میں وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''اسی دور میں محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر خواجہ غلام السیدین نے ٹریننگ اسکول سے ایک تعلیمی رسالہ ''تعلیم جدید'' جاری کیا تھا۔ جس میں مہاتما گاندھی کی بنیادی تعلیم کے نظریئے کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے نے یہاں کے تعلیمی معیار کو بڑھانے میں خاص رول ادا کیا۔ اس کے مدیر غلام رسول نازکی ہی تھے' جنہوں نے بڑی محنت سے اس رسالے کا اچھا معیار قائم کیا اور اُردو زبان سِکھانے میں بڑا رول ادا کیا۔''[1]

محکمہ تعلیم میں تقریباً ۲۲ رسال اپنے فرائض انجام دینے کے بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء میں نازکی صاحب کا تبادلہ ریڈیو کشمیر جموں میں ہوا۔ عبدالحق برقؔ اور ایس. این. کاچرو بھی اُن کے ساتھ ہی ریڈیو کشمیر جموں میں تعینات کئے گئے۔ اس طرح سے ان تینوں کی محفل خوب جمنے لگی۔[2] بعد میں جب اوّل جولائی ۱۹۴۹ء کو ریڈیو کشمیر سری نگر نے کام کرنا شروع کیا[3] تو نازکی صاحب کی خدمات بھی اسی اسٹیشن میں طلب کی گئیں۔ اِس طرح سے وہ ایک عرصہ تک پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ریڈیو کشمیر سے نشریات کا آغاز کرنے کا فخر بھی نازکی صاحب کو ہی ہے۔[4] وہ کچھ مدت کے لئے ناگپور اور اِندور کے ریڈیو اسٹیشنوں پر بھی کام کرتے رہے۔ نازکی صاحب نے اپنی ریڈیائی ملازمت کے دوران پروگراموں کو دِلچسپ بنانے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا اور عوام کی دِلچسپی کے لئے نئے نئے پروگرام رُو بہ عمل میں لائے۔ اِس طرح سے اُس زمانے میں اُن کے پروگرام خاص و عام میں مقبول ہوئے۔ شاعری کے علاوہ اُن کے بیسیوں مضامین، فیچر اور مقالات ریڈیو سے براڈکاسٹ ہوئے۔ اسی دور

---

[1] ڈاکٹر برج پریمی: جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو و نما' ص ۱۸۲

[2] میر غلام رسول نازکی صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر ایاز نازکی سے ایک ذاتی گفتگو سے

[3] آگہی (خبرنامہ) شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر' شمارہ ۳' ۸ اور ۹ رجون ۱۹۸۲ء ص ۱۳

[4] میر غلام رسول نازکی سے ایک مُلاقات

میں اُنہیں مُلک کے چوٹی کے ادیبوں کے ساتھ تبادلہ ءخیال کرنے کا موقعہ ملا۔ جن میں خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، رامانند ساگر، سہیل عظیم آبادی، محمود ہاشمی اور کمال احمد صدیقی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اِس طرح سے کئی سال تک محکمہ اطلاعات ونشریات میں فرائض انجام دینے کے بعد وہ ۱۹۶۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور فیلڈ سروے آرگنائزیشن کے محکمہ کی طرف سے شائع ہونے والے اخبار ہفتہ روزہ ''چمن'' کی ادارت میں شامل ہوگئے۔ نازکی صاحب اس کے بعد ''الغفران'' کے نام سے ایک ہفتہ روزہ بھی نکالتے رہے۔

میر غلام رسول نازکی کشمیر کے ادبی منظر نامے پر کئی دہائیوں تک چھائے رہے۔ اُن کے قریبی معاصرین میں مولانا فطرت کاشمیری، محمد امین داراب، نندلال کول طالب کاشمیری، دینا ناتھ چکن مست کاشمیری، رسا جاودانی، منوہر لال دِل، میکش کاشمیری، کشن سمیلپوری، شہہ زور کاشمیری، غلام علی بلبل کاشمیری، طاؤس بانپوری، حیرت کاملی، اور عبدالحق برق کے نام لئے جا سکتے ہیں' لیکن سیماب، حفیظ، جگر، جوش، ساغر، وامق، قمر جلال آبادی، ضمیر جعفری اور اختر الایمان کے ساتھ بھی اُن کے بڑے گہرے مراسم رہے ہیں۔

میر غلام رسول نازکی کا خاندان عالموں اور فاضلوں کا خاندان ہے۔ اُن کے والدِ بزرگوار اُردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبانوں پر خاصی دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ نازکی صاحب نے شعر وادب کا اولین درس اُنہی سے حاصل کیا اور پھر خود اپنے مطالعے کو اپنا رہنما بنایا۔ اگر چہ وہ کشمیری اور اُردو کے شاعر اور دانشور کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں لیکن اُنہوں نے اپنی شعر گوئی کا آغاز فارسی سے کیا۔ وہ غنی کاشمیری سے اتنے متاثر تھے کہ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری[۱] وہ شروع شروع میں خود بھی غنی کاشمیری کے قلمی نام سے ہی لکھا کرتے تھے۔ خود نازکی صاحب نے بھی اپنے ایک شعر میں غنی کاشمیری سے اپنی گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے' لکھتے ہیں:-

کہاں میں کہاں نغمہء زندگانی
مرے روپ میں جلوہ فرما غنی ہے

۱۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم): کشمیر میں اُردو (دوسرا حصہ)' ص ۳۸۵

غنی کاشمیری کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری میں غالبؔ، اقبالؔ، حالیؔ، جوشؔ، سیمابؔ اور حفیظ کا رنگ بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ شروع شروع میں اُن کی تخلیقات رسالہ "ادبی دُنیا" لاہور سے واپس آ گئیں لیکن اُنہوں نے مشقِ سخن جاری رکھی۔ اُن کی ایک نظم حضرت جوش ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ "کلیم" بھوپال میں چھپ گئی اور اِس طرح سے اُن کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اِس کے بعد اُنہوں نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی لکھیں اور اپنی پہچان منوانے میں کامیابی حاصل کی۔

اپنے ادبی سفر کے آغاز کے بارے میں میرے ایک استفسار کے جواب میں اُنہوں نے مجھے بتایا:۔

> "اس دور میں جوش صاحب بھوپال سے "کلیم" کے نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے۔ میں نے یہ نظم اُن کو اشاعت کی غرض سے بھیج دی جو اُنہیں کافی پسند آئی۔ اُنہوں نے اپنے رسالے کے سرورق پر یہ نظم شائع کی۔ اِس کے بعد یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ اور بھی بہت سے رسائل وجرائید نے اس کو نقل کر کے شائع کیا۔ اس طرح سے میری کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔"[1]

نظم "ایک اندھی لڑکی کی دُعا" اسی دور کی ایک یادگار نظم ہے، جس میں ایک اندھی لڑکی دُنیا کے تمام رنگوں اور خوشبوؤں کو اپنی ماں پر قربان کرنا چاہتی ہے اور خُدا سے دُعا کرتی ہے کہ وہ اُس کو بینائی عطا کرے تاکہ وہ اپنی ماں کو دیکھ سکے۔ دیکھئے نازکی صاحب نے اِن جذبات کو اپنی نظم میں کس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے:۔

تُو نے تاروں کو ضیا بخشی ہے سورج کو جمال — بارشِ اُنوار سے دُنیا کی کھیتی ہے نہال
نور پاشی میں قمر ہے آپ ہی اپنی مثال — مُجھ کو ان چیزوں کی کچھ خواہش نہیں اے ذوالجلال
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

نازکی صاحب منکسر المزاج تھے۔ شروع شروع میں وہ ادبی تقاریب میں حصّہ لینے سے جھجک سی محسوس کرتے تھے لیکن مولانا مسعودی کی حوصلہ افزائی سے اُن میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پھر وہ باقاعدگی کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگے اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے رہے۔ میرے

---

۱ مرحوم میر غلام رسول نازکی کے ساتھ ایک یادگار ملاقات

پوچھنے پر اُنہوں نے اپنی ادبی زندگی کی تفصیل یوں پیش کی:-

"۱۹۳۶ء میں جب ایک مشاعرے میں غزل سنانے کے لئے کہا گیا تو مُجھے بے حد جھجک سی محسوس ہوئی لیکن مولانا مسعودی نے حوصلہ افزائی کی تو میں نے ایک غزل سُنائی۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

جہاں جاتا ہوں پہلے حال کہتا ہوں حسینوں کا
اَدب کرتا ہوں اِن کاشانہ دِل کے مکینوں کا

———— تو یہ غزل بہت پسند کی گئی اور مُجھ میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔"[۱]

اسی زمانے میں کشمیر میں انجمن اخوان وصفا کے نام سے ایک ادبی انجمن وجود میں آئی۔ اس انجمن کے ساتھ مولانا فطرت کاشمیری، حیرت کاملی، محمد امین بچھ اور محمد امین داراب وغیرہ شامل تھے۔ یہ سب اُردو اور فارسی کے ساتھ گہرا شغف رکھتے تھے۔ اِس انجمن کے زیرِ اہتمام مولانا فطرت کاشمیری کے دولت خانے پر چند یادگار ادبی نشستیں منعقد ہوئیں۔ جن میں نہ صرف مقامی شعرا شرکت کرتے تھے بلکہ باہر سے آئے ہوئے بعض مہمان شعرا بھی حصّہ لیا کرتے تھے، جن میں روش صدیقی، احسان دانش، تاثیر، محروم، جگر، حفیظ، ساغر اور قمر جلال آبادی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ اِن محفلوں میں نازکی صاحب بھی اپنے کلام سے جادو جگاتے رہے اور اُن کے چاہنے والوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہو گیا۔

نازکی صاحب ادبی تقاریب کے دِلدادہ تھے۔ ۱۹۳۷ء میں جب وہ لاہور سے واپس آگئے تو اُنہوں نے اپنے عزیز دوست قیس شیروانی کے تعاون سے سری نگر میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد کرنے کا اہتمام کیا[۲]۔ جس میں حفیظ جالندھری، احسان دانش، روش صدیقی اور تاثیر نے حصّہ لیا۔ اس یادگار مشاعرے کی صدارت سر تیج بہادر سپرو نے کی تھی۔

بخشی صاحب کے دورِ حکومت میں جب جشنِ کشمیر منانے کا سلسلہ شروع ہوا تو نازکی صاحب کو

---

۱ مرحوم میر غلام رسول نازکی کے ساتھ ایک یادگار مُلاقات

۲ ماہنامہ "شیرازہ" سری نگر [illegible] جلد ۲۹ شمارہ ۱-۲ ص ۱۵۱

ہی جشنِ کشمیر کی سلبریشن کمیٹی کی ایک ذیلی شاخ لٹریری کمیٹی کا کنوینز بنایا گیا[1]۔ اس طرح سے اُنہوں نے کشمیر میں بے شمار کل ہند مشاعرے منعقد کروائے۔ جن میں برِ صغیر ہندو پاک کے چوٹی کے شعرا حصہ لیا کرتے تھے۔ اِن مشاعروں میں وہ خود بھی اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے رہے اور داد و تحسین حاصل کرتے رہے۔ کُچھ عرصہ کے بعد سری نگر کے شیر کشمیر پارک میں ایک تاریخی مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس یادگار مشاعرے کی صدارت ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے کی۔ یہ مشاعرہ رات گئے تک جاری رہا۔ نازکی صاحب نے اِس مشاعرے کے بارے میں مُجھے ایک گفتگو میں بتایا:-

''شیرِ کشمیر پارک میں مولانا مسعودی کے کہنے پر ایک مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کی صدارت اُس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے فرمائی۔ اس مشاعرے کی کارروائی رات کے تین بجے تک چلتی رہی۔ لوگ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ہمہ تن گوش تھے۔ یہ مشاعرہ کشمیر کی ادبی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو پیش کرنے کا فخر بھی مُجھے حاصل ہے۔ اس میں، میں نے جو رُباعی پڑھی، اُس کو خوب داد ملی اور پنڈت نہرو کو بھی یہ رُباعی پسند آئی۔''[2]

نازکی صاحب کی یہ رُباعی آپ بھی ملاحظہ کیجئے

کون کہتا ہے شبِ غم کی سحر ہونے لگی
امن و آزادی کی صورت جلوہ گر ہونے لگی
جب سے ڈالی فکرِ انسان نے ستاروں پر کمند
زندگی دشوار تھی، دشوار تر ہونے لگی

۱۔ ماہنامہ ''شیرازہ'' سری نگر ۲۰۰۱ء، جلد ۳۹، شمارہ ۴-۶، ص ۱۵۹

۲۔ میر غلام رسول نازکی صاحب کے ساتھ ایک یادگار مُلاقات

نازکی صاحب فارسی شعروادب کے بھی دلدادہ تھے۔ وہ بچپن سے ہی فارسی اشعار پر غور وخوض کرتے تھے اور عرفیؔ، سعدیؔ اور بیدلؔ کا کلام گنگنایا کرتے تھے۔ اقبال اور غنی کے کلام سے بھی اُنہیں بچپن سے ہی دِلچسپی تھی، اِسی دِلچسپی نے اُن سے بعض اچھی فارسی غزلیں کہلوائیں۔ اُن کا فارسی کلام رُوس کی کلچرل سوسائیٹی نے بھی شائع کیا ہے اور اُنہیں فارسی کے قدآور شعرا میں جگہ دی ہے۔ بلبل کاشمیری؛ جن کے نازکی صاحب کے ساتھ گہرے تعلقات رہے ہیں' نے میرے ایک استفسار کے جواب میں نازکی صاحب کی فارسی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:-

''نازکی صاحب فارسی کے مستند شاعر ہیں۔ اُن کی ایک خوبصورت اور لاجواب فارسی نظم لالہ کول (LALA RIVER) کوششِ بسیار کے باوجود بھی دستیاب نہ ہوسکی۔ رُوس کی کلچرل سوسائیٹی نے ۱۹۶۷ء میں ایک کتاب'' مشاعرہ'' کے عنوان سے چھاپی ہے۔ اس میں وسط ایشیا، افغانستان، ایران اور اِنڈو پاکستان کے فارسی شعرا کے فارسی کلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ زیادہ کوریج ڈاکٹر اقبال کو دی گئی ہے۔ اِس کتاب میں نازکی صاحب کی ایک فارسی غزل بھی چھپی ہے۔''

غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

مرغلے وہی شب بہ گُل زارے بہ شاخ می سرُوذ
شاہد گل را بتاتے نیست دِل وادئ چہ سود
ہر کہ را حُسنے عطا کر وند او قاتش کم است
بلبل از گل، گل زِ شبنم، شبنم از انجم شنود

میر غلام رسول نازکی کشمیر کے سربرآوردہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کے تین شعری مجموعے ''دیدۂ تر'' (۱۹۴۹ء)، ''چراغِ راہ'' (۱۹۸۹ء) اور ''متاعِ فقیر'' (۱۹۹۶ء) اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ان تینوں شعری مجموعوں میں اُن کی رنگارنگ شاعری دیکھنے میں آتی ہے اور یہ اخذ کرنا بہت ہی مُشکل ہو جاتا ہے کہ وہ غزل کے اچھے شاعر ہیں یا نظم کے۔ قطعات اور رباعیات کہنے میں بھی وہ کمال رکھتے تھے۔

عصر حاضر کے معروف شاعر اور صحافی حکیم منظور ''متاعِ فقیر'' کے پیش لفظ میں ناز کی صاحب کی رنگا رنگ شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

> ''میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ متاعِ فقیر کا شاعر نعت کا شاعر ہے یا مناجات کا، نظم کا شاعر یا غزل کا، قطعات کا شاعر ہے یا رُباعیات کا۔ کبھی نعت نے وجد طاری کیا تو کبھی مناجات نے مسحور کیا۔ کبھی نظم نے دِل پر آرے چلائے تو کبھی غزل نے دِل پر چھاپا رکھا۔ کبھی قطعات سے آسودگی میسر ہوئی تو کبھی رُباعیات نے مشامِ جاں معطر کیا۔ کُچھ اُن سب کو ملا کر ایک مکمل اور قد آور شاعر ہر نظروں میں تعمیر ہوا۔''[۱]

ناز کی صاحب کی شاعری میں قدیم اور جدید شاعری کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن سے ہی فارسی شاعری سے زبردست دِلچسپی رکھتے تھے۔ اُنہوں نے جہاں حافظ، سعدی، غالب، غنی اور اقبال کے فارسی کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا وہاں اُنہیں اُردو شاعری کی روایات کا بھی زبردست اِدراک تھا۔ اِسی لئے اُن کے یہاں جدید شاعری کے ساتھ روایتی شاعری کی رعنائیاں بھی ملتی ہیں۔ اُنہیں فارسی شاعری سے اِتنا شغف تھا کہ بعض اوقات اُنہیں اپنے اندر سے غنی کی آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

ناز کی صاحب کی شاعری میں عشقیہ جذبات کی کارفرمائی بھی ملتی ہے اور موجودہ زمانے کا آشوب بھی نمایاں طور پر دیکھنے میں آتا ہے۔ فلسفیانہ افکار بھی اور حیات و کائنات کے مسائل بھی' ناز کی صاحب نے اپنی شاعری میں اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کو اپنے میٹھے اور سُلجھے ہوئے الفاظ میں کُچھ اِس طرح سے برتنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ ایک نئی دُنیا سامنے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ناز کی صاحب ہمیشہ اشاروں اور کنایوں میں گہری بات کہنے کے قائل تھے اور یہی ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری حُسن و عشق کو ناز کی صاحب کی شاعری کا ایک اہم جزو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک مضمون میں اس بات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

---

۱۔ میر غلام رسول ناز کی: ''متاعِ فقیر'' ۱۹۹۷ء ص

''نازکی صاحب کا مزاج عاشقانہ ہے۔ اُن کے جذبۂ عشق کی سطح بُلند ہے۔ وہ حُسن وعشق کے امتزاج سے ایک جمالیاتی فضا کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہ فضا جذبات کی قوسِ قزح سے دمکتی ہے۔''[1]

نازکی صاحب غزل کے زبردست عاشق تھے۔ اس نازک صنفِ سخن کو وہ متاعِ عزیز سمجھتے تھے اور اس میں اُن کے قسم قسم کے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں۔ اُن کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں غزل کے کلاسیکی مزاج سے بخوبی واقف تھے وہاں نئے غزل کے مزاج سے بھی آشنائی رکھتے تھے۔ اِسی لئے اُن کی غزل ایک نئی آن بان کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ غالباً اس بات کا احساس خود نازکی صاحب کو بھی تھا۔ اِسی لئے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

چمن میں رنگ ونور ہے مرے نوا کی دلکشی
اگر غزل میں بانکپن نہیں، مری غزل نہیں

نازکی صاحب علاّمہ اقبال سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ چنانچہ اُن کی شاعری میں اقبال کے فکروفن کے واضح اثرات دیکھنے میں آتے ہیں۔ اُنہوں نے علامہ اقبال کی تراکیب، علائم اور افکار سے خوب کام لیا ہے۔ ایمانِ بقدرِ طول، تصویرِ قدس، جبینِ ناز، طائرِ سدرہ، نغمۂ جبرئیل، فغانِ نیم شبی، صورِ اسرافیل، نالۂ صبح گاہی، آدمِ خاکی، نغمۂ داؤد، جیسی تراکیب اور علائم اُنہوں نے علامہ اقبال کی شاعری سے اخذ کئے ہیں اور پھر اپنے جذبات کو ایک الگ اور مؤثر طریقے سے الفاظ کے سانچے میں اُتار کر پیش کئے ہیں۔ نازکی کے درج ذیل اَشعار اُن پر علامہ اقبال کے اثرات کی پوری پوری دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

؎ تمہارے ساتھ تھا ہر لحہ نغمۂ جبرئیل — وہ نغمہ جس میں معنی کی رُوح بھی تحلیل
؎ فغانِ نیم شبی ہے کہ نغمہ داؤد — اذانِ وقتِ سحر ہے کہ صورِ اسرافیل
؎ ترا مقام، مقامِ رضا سے آگے ہے — خودی نہ بیچ طفیلی نہ بن، سوال نہ کر
؎ یاالٰہی ہو تمہارے آسماں والوں کی خیر — آدمِ خاکی نہیں ہے اب مہِ کامل سے دور

[1] ماہنامہ ''شیرازہ'' سرینگر، جلد نمبر ۳۹ شمارہ ۲-۴ ۲۰۰۱ء ص ۱۴۲

؎ جب اناالحق کہنے والے لوگ ہی رخصت ہوئے　　پھر زبان پر قصۂ دار و رسن کب آئے گا

؎ ایک ہنگامہ تو تھا، اب کس کو اتنا ہوش ہے　　صورِ اسرافیل تھا یا نغمہ داؤد تھا

میر غلام رسول نازکی کی غزلوں میں کشمیر کے حُسن کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کشمیر کے دِلنواز فضاؤں کے متوالے تھے۔ کشمیر کا کلچر، یہاں کی تہذیب اور تمدن اُنہیں نہایت ہی عزیز تھی۔ اسی لئے وہ کبھی کشمیر کے فلک بوس پہاڑوں سے سرشار ہوتے ہیں اور کبھی موسمِ خزاں میں آتشِ چنار کا نظارہ کرنے لگتے ہیں۔ کبھی صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے اپنا دِل بہلانے لگتے ہیں اور کبھی رات کی تنہائی میں چاند کا عکس جھیل ڈل کے صاف و شفاف پانیوں میں دیکھتے ہیں۔ اِسی لئے ایک جگہ اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں ؎

اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی
شیراز کی شادابی، کشمیر کی رعنائی

اقبال اور کشمیر نازکی صاحب کے دو اہم موضوعات ہیں۔ ان موضوعات سے وہ قلبی مناسبت رکھتے تھے۔ اِسی لئے اُن کی شاعری میں ان دونوں موضوعات کا بڑے مؤثر الفاظ میں اظہار ملتا ہے۔ ایک جگہ اقبال کے لہجے میں کہتے ہیں ؎

ترا مقام، مقامِ رضا سے آگے ہے
خودی نہ بیچ، طفیلی نہ بن، سوال نہ کر

نازکی صاحب کی نظموں میں بھی کشمیر کا تصوّر اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ اُبھرتا ہے۔ اگرچہ غزل میں اُنہوں نے کشمیر کا ذِکر اشاروں اور کنایوں میں کیا ہے اور یہاں کے لازوال حُسن اور یہاں کے کلچر کی دِل کھول کر داد دی ہے، لیکن اپنی نظموں میں اُنہوں نے کشمیر کے تئیں اپنے جذبات اور احساسات کا کُھل کر اظہار کیا ہے۔ اس ضمن میں اُن کی نظمیں ''کشمیر''، ''آمدِ بہار'' اور ''دیوار'' وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

؎ یہ برف یہ کہسار یہ وادی یہ مناظر　　چاندی کی انگوٹھی میں زمرد کا نگینہ

؎ شاعر کے حسیں خواب کی تعبیر ہے کشمیر　　پُرکار مصوّر کے تخیل کی حسینہ

؎ قدِ کہسار رہتا پا جمیل برف پوش　　دامنِ کہسار پُر گل اور ہوا ریحاں فروش

کشمیر کا ذکر جب بھی زبان پر آتا ہے تو منظر نگاری اور فطرت پرستی کا تصوّر بھی اُبھرتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہیں گے کہ کشمیر اور فطرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ چونکہ نازکی صاحب نے کشمیر کی حسین وادیوں میں پرورش پائی' لہٰذا وہ یہاں کی عطر بیز فضاؤں سے مسحور ہوئے تھے۔ اِسی لئے اُن کی شاعری میں کشمیر کے حُسن کا ایک مربوط تصوّر جگہ جگہ اُبھر کے آیا ہے اور یہ تصوّر نہ صرف اُن کی غزلوں اور نظموں میں ہی جگہ پاتا ہے بلکہ اُن کے قطعات اور رُباعیات میں بھی اُمڈ آیا ہے۔ مثلاً:-

ے اِک سہانی چاندنی رات اور مانسبل کی جھیل
حُسن کی چپ چاپ دُنیا جلد کا عکسِ جمیل
دُور تا حدِ نظر سرسوں کے کھیتوں کی قطار
آرزو کا سلسلہ لا اِنتہا' فرصت قلیل

ے مرے کشمیر کی ہر شے حسین ہے — یہاں کی ہر پہاڑی مہ جبین ہے
فلک پر اس زمین کی سرزمین ہے — فلک خود ڈل کے اندر تہہ نشین ہے

''متاعِ فقیر'' میں بعض ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن میں داخلی کیفیت ملتی ہے۔ یہ نظمیں اپنے اندر معنی کا ایک وسیع سمندر سمائے ہوئے ہیں اور انسان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی عکاسی کرتی ہیں۔ مُغالطہ، تمنّا، سید ضمیر جعفری، گڈریئے کا گیت، مزارِ دوست، اِستفسار اور بانگ درا وغیرہ نظمیں اِس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے بعض نظمیں اُن کے اوّلین دور کی نمائندگی کرتی ہیں اور اپنی تازگی اور توانائی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ نظم ''تمنّا'' میں وہ خُدا کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اس نظم میں وہ اپنی کھوئی ہوئی جوانی کے واپس آنے کی دُعا کرتے ہیں۔

''سید ضمیر جعفری'' کے نام سے جو نظم ''متاعِ فقیر'' میں ملتی ہے، اُس میں وہ اُردو کے اس قد آور شاعر سے اپنی ملاقاتِ اوّل کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

''گڈریئے کا گیت'' بھی ایک عمدہ نظم ہے اور کشمیر کے لازوال حُسن کے ساتھ ساتھ یہاں کے محنت کش عوام کی تصویر آنکھوں کے سامنے لاتی ہے۔ نظم ''مزارِ دوست'' نازکی صاحب کی ایک بہترین نظم ہے جس میں اُن کا ذاتی غم پنہاں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظم اُنہوں نے اپنی رفیقۂ حیات کے

اچانک بچھڑ جانے پر کہی ہے، کہتے ہیں:-

آج پھر اے دوست تیری قبر پر آیا ہوں میں
موتیوں کا ہار تیری نذر کو لایا ہوں میں
اشک کے موتی پروتا ہوں نظر کے تار میں
تیرے لائق اور کیا ہے دیدۂ خونبار میں

اب سوائے آرزوئے موت دِل میں کچھ نہیں
زندگی کا جذبہ جانِ مضمحل میں کچھ نہیں

نازکی صاحب کے قطعات اور رُباعیات بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان میں بھی اُن کے رنگارنگ خیالات اور جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ ان تخلیقات میں اپنی زِندگی کے تجربات پیش کرتے ہیں۔ ان تجربات میں فکرانگیزی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی، لیکن قطعات اور رُباعیات میں نازکی صاحب نے خود اپنی نجی زندگی کے بارے میں ہلکے پھلکے اشارے دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان قطعات اور رُباعیات میں مناظر فطرت کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور انسانی زندگی کے دور و کرب کا اظہار بھی ملتا ہے۔ دیکھئے اسلامی تفکر کی روشنی میں انسانیت کو کیا پیغام دیتے ہیں:-

تجھے خبر نہیں عالی مقام ہوں میں بھی — مِثل خضر علیہ السلام ہوں میں بھی
جہاں لوح وقلم میرے زیرِ فرماں ہے — محمد عربیؐ کا غلام ہوں میں بھی

اپنے ایک انوکھے احساس کو یوں زبان دیتے ہیں:-

مرے نغموں کی موسیقار تم ہو — مرا دیپک مرا ملہار تم ہو
میں فواروں میں کرلوں گا چراغاں — کہ میری شامِ شالامار تم ہو

منظر نگاری کا یہ نمونہ بھی ملاحظہ کیجئے:-

یہ شبِ مہتاب، یہ پانی سے مالامال جھیل — دامنِ کہسار کا جھرنا، عدیل سلسبیل
ہر اَدا مخمور، ہر جانب سکوں، ہر سُو سکوت — ہر پہاڑی طور، ہر منظر حسیں، ہر شے جمیل

''چراغِ راہ'' میر غلام رسول نازکی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کا آغاز اُنہوں نے ''نغمۂ توحید'' سے کیا ہے۔ ''چراغِ راہ'' کے نعتیہ کلام کا محرک وہ ۹ر جون

۱۹۸۹ء کا ایک واقعہ قرار دیتے ہیں، جب اُن کی زبان پر بِلا ارادہ یہ چار مصرعے آگئے تھے:۔

پھول کھلتے ہیں خارزاروں میں ۔۔۔ جب میں ذکرِ رسولؐ کرتا ہوں
دین دُنیا کی نعمتیں پا کر ۔۔۔ نقد قیمت وصول کرتا ہوں

اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے وہ ''چراغِ راہ'' کے سرنامے میں لکھتے ہیں:۔

''اس قطعہ کا ذہن پر زبردست اثر رہا اور پھر اسی بحر میں قطعات بنتے گئے، جو سب کے سب نعت رسولؐ پر متضمن تھے۔ ۲۶/جون تک ان کی تعداد سو سے متجاوز ہوگئی۔ میں نے چاہا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ مگر اچانک بند ہوا۔ اس کے بعد میں نے بہت کوشش کی لیکن ایک قطعہ بھی نہ بن سکا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سارے اُردو کلام کو چھاپنے سے پہلے اپنا نعتیہ کلام شائع کروں، جس میں یہ قطعات شامل ہوں گے۔''[1]

''چراغ راہ'' کے قطعات پیش کئے جاتے ہیں، جن میں اِسلامی تفکّر کی روشنی میں اِنسانی زندگی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً:۔

صبح کا وقت دِل میں کیف و سرور ۔۔۔ غم و اَندوہ دُور، دِل مسرور
رُوح مخمور، وجد میں ہیں طیور ۔۔۔ وردِ جن و بشر، درود حضورؐ

فطرت اللہ کی ادائے جمیل ۔۔۔ شاہکار فن خدائے جلیل
تاجدارِ حرم دُعا کے خلیل ۔۔۔ اِک نگاہِ کرم شفائے علیل

آپ کا دین جان و دِل سے قبول ۔۔۔ منطقی کا غرور، نا منظور
نقش بر سنگ آپؐ کی تلقین ۔۔۔ فلسفی کا فتور، نا منظور

''چراغِ راہ'' کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نازکی صاحب نہ صرف غزل، نظم، قطعہ اور رُباعی کے ہی شاعر تھے بلکہ نعت گو شعرا میں بھی وہ اِمتیازی مقام رکھتے تھے۔ اُن کی نعتیہ شاعری بھی گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے اور اپنے اندر گہرا اِدراک رکھتی ہے۔

[1] میر غلام رسول نازکی: چراغِ راہ، ص ۷-۸

عصرِ حاضر کا نمائندہ غزل گو شاعر

ـــــــــــ مظہر امام

مظہر امام کا شمار عصرِ حاضر کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اگرچہ نظم ونثر دونوں اُصناف میں طبع آزمائی کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کا اصل میدان شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے غزل اور نظم کے علاوہ شاعری کی دُوسری اصناف میں بھی اپنے جو ہر دکھائے اور اسلوب کی تازہ کاری سے اس میں نئے رنگ بھر دیئے۔ مظہر امام نے آزاد غزل کے نام سے ایک نیا تجربہ بھی کیا ہے اور اُردو شعروادب میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔

مظہر امام نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اُس زمانے میں ترقی پسند تحریک شباب پر تھی اور اُس تحریک نے اپنی کمند اُردو کے ہر چھوٹے بڑے قلمکار پر لگائی تھی۔ مظہر امام شروع شروع میں اس تحریک سے متاثر ہوئے اور اپنی شاعری سے اپنے معاصرین میں ایک اِنفرادی جگہ بنائی۔ اُن کی شروع کی شاعری میں اس تحریک کے اثرات نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ لیکن جب اُن کا شعور پختہ ہو گیا تو اُن کی شاعری میں بھی رفتہ رفتہ تبدیلی آتی گئی۔ اُنہوں نے اپنے جذبے اور احساس کی گہرائیوں کو نئے آہنگ اور نئے لب و لہجے میں پیش کر کے اپنے لئے ایک منفرد راہ متعین کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ' مظہر امام کی شاعرانہ اِنفرادیت کا اِعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''مظہر امام ہماری شاعری میں کسی دھماکے سے داخل نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے فکر و خیال کو خلوص و درد کی دھیمی آنچ میں تپا کر اپنے لئے رفتہ رفتہ جگہ پیدا کی ہے۔ اُن کی شاعری کا رُخ نئے تقاضوں کی طرف ہے لیکن نئی سطح پر اُنہوں نے روایت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ اس سے اُن کے اسلوب و اظہار میں ایک خوش آہنگ روانی اور بے تکلفی آ گئی ہے۔ اُن کی شاعری ایک سنبھلی ہوئی طبیعت اور صحت مند افتادِ ذہنی کا پتہ دیتی ہے۔''[۱]

مظہر امام کا شمار یوں تو نئے غزل گو شعرا میں ہوتا ہے لیکن اُنہوں نے روایتی شاعری کا دامن ہرگز نہیں چھوڑا۔ وہ شروع سے ہی نئے شعرا کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شعرا کا بھی بغور مطالعہ کرتے رہے۔ اِسی لئے ان کے ابتدائی کلام میں روایتی غزل کی ساری رعنائی ملتی ہے۔ مظہر امام نے غزل کو روایت کے ساتھ ساتھ عصری میلانات اور نئی حِسیات سے آگاہ کیا۔ اُن کی غزلوں میں تجربوں کی وُسعت اور لہجے کا عمق ملتا ہے۔ مثلاً

- شہر اُگنے والا ہے' سانس رُکنے والی ہے — جنگلوں کے جلنے کی دُور سے سماں دیکھوں
- اِسی اُمید پہ اربابِ شہر زندہ ہیں — کہ اس پہاڑ سے آگے بہت اُجالا ہے
- وسعتیں اپنی لئے سمٹی ہوئی دُنیا میں ہوں — میں سمندر ہوں مگر خود پیاس کے صحرا میں ہوں
- اُس کی دہلیز کے سورج کو اُگانے آئے — اپنی دیوار کا سایا جو گھنیرا ہوتا
- دِن کا سورج آگ اُگل کر آخر خود بھی راکھ ہوا — سوکھی پیاس رات پیاپے سپنوں کی برسات کرو
- ایک ہی موسم ہے آنکھوں کا اَلم ہو یا نشاط — میں مگرمچھ کی طرح احساس کے دریا میں ہوں

مظہر امام کی بیشتر غزلیں رُوح کو تازگی عطا کرتی ہیں۔ اُن کی غزلوں میں حُسن و عشق کے نِت نئے مضامین انتہائی متاثر کن ہیں۔ وہ چونکہ خود عشق کی لذّت سے آشنا ہیں اس لئے حُسن و عشق کی نزاکتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ حُسن و عشق کی یہ مِلی جُلی کیفیت اُن کی بیشتر غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ اُن کے اوّلین شعری مجموعے ''زخمِ تمنا'' (۱۹۲۶ء) کی شاعری میں ان تمام جذبات کا اِظہار ملتا

۱۔ مناظر عاشق ہرگانوی (مرتبہ) مظہر امام۔ایک تعارف ص ۳۱

ہے۔ مثلاً کہتے ہیں

؎ تمہارے حُسنِ تکلم میں پہلوئے دشنام　　تمہاری چشمِ فسوں سازتیغِ خون آشام

؎ مانا نگاہِ عشق بھی بے تاب تھی مگر　　ان سے زیادہ آپ کے جلوے تھے بے قرار

؎ خردنصیب نہ کر طنز میری شورش پر　　جنونِ عشق کے آداب جانتا ہوں میں

؎ دامنِ عشق کا بھلا کیا ذکر　　دامنِ حُسن تارتار ہے آج

غمِ جاناں اور غمِ دوراں یوں تو مظہر امام کی غزل کا ایک خاص موضوع رہا ہے مگر اس میں بھی اُن کے یہاں ایک جداگانہ تصور ملتا ہے۔ اُن کے مطابق یہ کائنات مصائب وآلام کا گھر ہے اور یہاں جو بھی غم، مصائب، اُلجھن اور پریشانیاں ہیں، اُن میں ہر ایک فرد کسی نہ کسی طرح گرفتار ہے۔ مظہر امام اپنی حساس طبعیت کی وجہ سے ساری کائنات کے غم کو اپنا غم تصور کرتے ہیں اور اس سے بالکل نہیں گھبراتے بلکہ اِنسان کو اِس کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ دراصل وہ غمِ دوراں کو غمِ جاناں کی ہی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔ اُن کے ہاں جینے کی تمنا کبھی بھی مفقود نہیں ہوتی۔ وہ حزن و ملال کی کیفیتوں سے کس قدر سرشار رہے ہیں، اس کا اندازہ اِن اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:۔

؎ مانتا ہوں کہ کنارے کی تمنا ہے مجھے　　میں نے طوفاں سے کیا پھر بھی کنارا تو نہیں

؎ روزِ ازل سے تشنگی حالات ہے نصیب　　پھر بھی مئے حیات کا اُترا نہیں خمار

؎ زندگی کو تھا نہ اپنی کج کلاہی کا غرور　　آستانِ ناز پر جب تک جبیں سنائی نہ تھی

؎ ہوا جاتا ہے اپنا بھی پرایا　　اِسی کا نام دُنیا ہے خدایا

؎ اِدھر اُلجھن پہ اُلجھن بڑھ رہی ہے　　اُدھر زُلفیں کوئی سُلجھا رہا ہے

مظہر امام کی شاعری محض رسمی شاعری نہیں ہے بلکہ اس میں روایت اور جدت کا جو ایک خاص قسم کا اِمتزاج ملتا ہے وہ اُن کو نئے شعرا کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں جدیدت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری کا لوچ اور رس بھی ملتا ہے۔ چونکہ اُنہوں نے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے وہ غزل کی جمالیات میں اس کی ہیئت کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ غزل کی تخلیق میں کلاسیکی نظم وضبط اور فنکارانہ جمال کا ایک خاص تصوّر اُن کے پیشِ نظر رہا ہے۔ نریش کمار شاؔد اُن کی شاعری کو تازہ اور شاداب شاعری تصوّر کرتے ہیں، جس میں روایت اور جدّت کا خوبصورت اِمتزاج ملتا ہے۔ مظہر امام کی

شاعرانہ اِنفرادیت کی وضاحت کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:-

''مظہر امام کی بہارِ صبح کی طرح تازہ وشاداب شاعری میں روایت اور جدت کا نہایت متوازن اور خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ اُن کی غزلوں کے اکثر اشعار نے مجھے یہ ماننے پر مجبور کردیا ہے کہ وہ سچے اور حقیقی شاعر ہیں۔ مظہر امام کی جاندار شاعری اُردو شعر وادب میں جمود کے دعوے کی نہایت شاندار تردید کرتی ہے اور اُردو شاعری کا مستقبل اُن سے بلاشبہ بہت بڑی اُمیدیں وابستہ کرسکتا ہے۔'' [۱]

شعر میں مفہوم کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ندرتِ اِظہار کی بے باکی میں فنکارانہ حُسن اور شعر میں دبیز معنوی تہ داری پیدا کرنا اور طنزیہ لہجے کا بھرپور اور برمحل اِستعمال کرنا مظہر امام کی شاعری کا خاصا رہا ہے۔ چند اَشعار ملاحظہ ہوں:-

جس کے گھر کی نالیاں کیڑوں کی ہیں تفریح گاہ — وہ بھی لے کر عزمِ تزئینِ چمن آجائے ہے

پُل ہی پُل سڑکیں ہی سڑکیں عشق ہے بے امتحاں — آج رستے میں کوئی دریا نہیں صحرا نہیں

سب ترا ہی قصور ہے ورنہ — حُسن تو بے گناہ ہے اے دِل

آج ہر زخم کے مُنہ میں ہے زباں پر فریاد — میرے عیسیٰ کی ذرا چارہ گری تو دیکھو

مظہر امام نے غزل کو مواد اور ہمہ گیری سے آراستہ کیا ہے۔ اُنہوں نے اسے عصری میلانات اور نئی حِسیت عطا کی۔ اُن کی غزلوں میں بادِ صبا کی نرمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وارداتِ قلب اور اِنسانی زِندگی کے دوسرے مسائل اُن کی غزلوں میں بدرجہ اَتم موجود ہیں۔ ''رِشتہ گونگے سفر کا'' (۱۹۷۴ء) کی غزلوں میں اِن تمام چیزوں کا کُھل کر اظہار ملتا ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے واضح اَلفاظ میں ان تمام باتوں کی طرف اِشارہ کیا ہے کہ مظہر امام کی شاعری میں عصری آگہی کا عرفان ملتا ہے۔ وہ مظہر امام کے زیرِ بحث مجموعے کے نام کو بھی معنی خیز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''مظہر امام ہمارے اُن ممتاز شعرا میں سے ہیں جن کے یہاں عصری میلانات اور نئی حِسیت کی عکاسی کے ساتھ اپنی ساری

---

۱ مناظر عاشق ہرگانوی، مرتبہ: مظہر امام - ایک تعارف، ص ۲۵

ادبی روایت کا عرفان بھی ملتا ہے۔ اُن کے یہاں غم وغصہ یا بیزاری
کے بجائے ایک سچے فنکار کا گمبھیر لہجہ ہے۔ اس مجموعے کا نام معنی خیز
ہے اور اس خاموش سفر اور تلاش وجستجو کی طرح اِشارہ کرتا ہے جو اپنے
اندر بڑی بلاغت لئے ہوئے ہے۔''[۱]

مظہر امام کی غزلوں میں تجربے کی وسعت اور لہجے کا عمق ملتا ہے۔ یہ تجربے نہ صرف موضوع اور اسلوب کے تجربے ہیں بلکہ زبان و بیان اور علامت سازی کے تجربے بھی ہیں۔ اُن کی شاعری میں موجودہ عہد کے فرد کی محرومی اور اُس کا درد و کرب موجود ہے۔ اُن کے اشعار میں مشینی دَور کے ماحول کا جس طرح کا احساس ہوتا ہے، وہ اسی کو الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ مظہر امام کی غزلوں میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ اُن کی غزلیں تہہ دار، رواں اور کیف وسرمستی سے لبریز ہیں۔ وہ شاعرانہ اِظہار کے لئے علامتی اسلوب استعمال کرتے ہیں اور اپنی لاشعوری گتھیوں کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں پارہ پارہ اِنسانی وجود نظر آتا ہے۔ مصرعوں کی ہم آہنگی اور زبان وبیان کا اِس طرح کا اِستعمال اُن کی غزلوں کو دوآتشہ بنا دیتے ہیں۔ مثلاً :-

ے یہ کیسے دور کا سقراط بن کے جینا تھا ۔۔۔ بجائے زہر مجھے گالیوں کو پینا تھا

ے میں تو اس حشرِ تماشا میں خدا بن کے رہا ۔۔۔ تُو بھی اس بھیڑ میں ہوتا تو اکیلا ہوتا

ے لفظوں کی تیز دھوپ میں یہ بھی جھلس نہ جائے ۔۔۔ مگر برہنہ جسم پہ چادر ہی ڈال دے

ے رنگ کیا دکھاتا ہے خونِ رائیگاں دیکھوں ۔۔۔ دھار تیز ہے کتنی رکھ کے اُنگلیاں دیکھوں

''رشتہ گونگے سفر کا'' کی غزلوں میں محاورات کا کثیر الاستعمال ملتا ہے۔ ان محاوروں نے مظہر امام کی غزلوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ بعض جگہوں پر معمولی خیال کو ان محاوروں نے ایسی مہمیز عطا کی ہے کہ خیالات کی رفعت پیدا ہوگئی ہے۔ اِن میں سے بعض محاورات تو عام بول چال میں استعمال ہوتے ہیں مگر اپنے اندر گہری معنویت رکھتے ہیں۔ جوئے شیر لانا، صبح کا بھولا، دِل کو پتھر کرنا، پتھر کا جگر، کام آنا، جی لینا، آنکھ چُرانا، ہاتھ میں پتھر، دو دو ہاتھ، آگ اُگانا، مُنہ کالا، بھولا بھٹکا، دم گھٹنا وغیرہ

---

۱ مناظر عاشق ہرگانوی، مرتبہ: مظہر امام-ایک تعارف، ص ۱۱۳

محاورات کو مظہر امام نے جس بجے تلے انداز اور جس خوبی کے ساتھ اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے وہ فقط اُنہی کا خاصہ ہے۔ ان محاورات کا زیر و بم ملاحظہ ہو:۔

ے وہ تو خیر یوں کہئے ذوقِ حُسن ہمدم تھا
جوئے شیر کیا لاتا عزم کوہ کن تنہا

ے صبح کا بھولا تو ہے شام کو واپس آ جائے
اور کہہ دے کبھی میں نے تمہیں چاہا ہی نہیں

ے ہر آئینے سے آنکھ چُراتے رہے ہیں آج ہم
کل تیری جستجو تھی کہ تھی اپنی جستجو!

ے ظاہر و باطن دونوں یکساں
مُنہ بھی کالا، دِل بھی کالا

ے ایک نویلی دلہن بن کر اُس دِن اندر آیا تھا
جانے کب کا بھولا بھٹکا لمحہ آدھی رات گئے

ے دِن کا سورج آگ اُگل کر آخر خود بھی راکھ ہوا
سوکھی پیاس رات یہ اپنے سپنوں کی برسات کروں

''پچھلے موسم کا پھول'' طبع دوم (۱۹۸۸ء) مظہر امام کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی شاعری نہ تو مظہر امام کے اوّلین شعری مجموعے ''زخمِ تمنا'' کا رنگ لئے ہوئے ہے اور نہ ہی اس میں ''رشتہ گونگے سفر کا'' کی شاعری کا رنگ دکھائی دیتا ہے بلکہ اِس کا اپنا ایک انفرادی رنگ ہے۔ مظہر امام نے اگرچہ روایتی شاعری سے شعر گوئی کا آغاز کیا لیکن ''پچھلے موسم کا پھول'' تک آتے آتے وہ تخلیق کے بہت سے مراحل سے گزر چکے ہیں۔ اُنہوں نے ترقی پسند شاعری کا دور بھی دیکھا اور ادب کے جدید رجحانات سے بھی ناطہ جوڑا جس کی بدولت اُن کی شاعری میں اِن دونوں میلانات کے اثرات کما حقہٗ ملتے ہیں۔

پروفیسر آلِ احمد سرور نے مظہر امام کے اِس شعری مجموعے کے پیش لفظ میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ مظہر امام کو نہ تو ترقی پسند شاعر قرار دیتے ہیں اور نہ اُن کا شمار جدیدیوں میں کرتے ہیں۔ بلکہ وہ اُنہیں ان دونوں میلانات کی درمیانی کڑی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ''مظہر امام ترقی پسندی سے چلے تھے۔ وہ جدیدیت کی طرف مائل ہوئے مگر اُن کا شمار جدیدیوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں' اُن دونوں میلانات سے اُنھوں نے اپنے ذہنی سفر میں اثر قبول کیا ہے۔ اُن کے پاس حساس ذہن ہے اور وہ زِندگی کے اِس آشوب سے' جو آج کے دور سے عبارت ہے' آشنا ہیں۔'' [1]

مظہر امام ایک لمبے عرصے تک کشمیر کی غزل کے عنوان کے تحت بھی اپنی شاعری کا جادو جگاتے رہے۔ بعض ناقدینِ فن کی رائے ہے کہ کشمیر کی غزل مظہر امام کی آزاد غزل کی طرح کوئی نیا تجربہ ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اُن غزلوں میں شاعر پر گزرے ہوئے واقعات اور کشمیر کے دوران کے حالات اور جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ ''پچھلے موسم کا پھول'' میں مظہر امام کی وہ غزلیں شامل ہیں جو مختلف علمی و ادبی رسائل و جرائد میں پہلے ہی ''کشمیر کی غزلیں'' کے عنوان سے چھپ چکی ہیں۔ چونکہ قیامِ کشمیر کے دوران وہ یہاں کے باغوں، جھیلوں، ندی نالوں اور آبشاروں سے مسحور ہوئے تھے، اُنہیں یہاں کے پراسرار سناٹوں اور دیوداروں سے لدے ہوئے گھنے جنگلوں سے دِلچسپی ہو گئی تھی۔ اِسی لئے اُن کی شاعری میں کشمیر کی خوبصورتی یہاں وہاں موہوم صورت میں نظر آتی ہے۔ مظہر امام مختلف علامتوں کے ذریعے سے کشمیر کی تصویر اُبھارنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہیں کہیں اپنے اَشعار میں واضح اِشارے بھی کرتے ہیں۔ مثلاً جن علامتوں سے اُنہوں نے کام لے کر اِس وادیِ رنگ و بُو کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ اُن میں چنار، خوشبو، گلاب، برف، موسم، دریا، ہوا، اَبر وغیرہ قابلِ ذِکر ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مظہر امام کی کشمیر کی غزلوں میں کشمیر کی کوئی بھی جھلک نظر نہیں آتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن غزلوں میں اگرچہ واضح طور پر

---

[1] مظہر امام: پچھلے موسم کے پھول، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰

کشمیر کی تاریخ یا جغرافیہ نہیں لیکن کشمیر کی خوشبو جا بجا ملتی ہے۔ اُن غزلوں میں نہ صرف کشمیر کا موسم، کشمیر کے درخت، کشمیر کا حُسن اور اُس کی خوبصورتی کہیں کہیں اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جھلکتی ہے، بلکہ زیرِ بحث شعری مجموعے کے اکثر و بیشتر اشعار ایسے ہیں جو شاعر پر گزرے ہوئے اُن واقعات و حادثات کی ترجمانی کرتے ہیں جن سے وہ اپنے قیام کشمیر کے دوران دوچار ہوئے ہیں۔ یہ واقعات و حادثات ان کی بیتی ہوئی زندگی کی یادیں ہیں جو اُن کے لئے ایک قیمتی اثاثہ سے کم نہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر اُنہیں کشمیر میں زندگی کے چند بہترین سال گذارنے کا موقع نہ ملتا تو وہ ان غزلوں میں سے بہتر اشعار کہہ ہی نہیں سکتے۔[۱] فیاض رفعت ''پچھلے موسم کا پھول'' کی غزلوں میں کشمیر کے عطر بیز فضاؤں، جھر جھر کرتے ہوئے جھرنوں اور آبشاروں اور رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق مظہر امام نے ''پچھلے موسم کا پھول'' کی غزلوں میں کشمیر کی پوری پوری مصوّری کی ہے۔[۲]

''پچھلے موسم کا پھول'' کے چند نمائندہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں اس وادیِ رنگ و بُو کے حُسن کی عکاسی کی گئی ہے:-

ے کشمیر کی غزلوں پر احسان اسی کا ہے
لفظوں کو قبادی ہے ہونٹوں کو نوادی ہے

ے یہ ساری برف گرنے دو مجھی پر
تپش تم سے ہوا ہے اور میں ہوں

ے اب چناروں پہ بھی آگ کھلنے لگی
زخم لو دے رہا ہے تیرے شہر میں

ے یہ پہلی برف ہے آنکھوں میں بھر لو
یہ موسم پھر بھی اُجلا نہ ہوگا

ے تجھ کو پانے کے لئے اُس کو بھلانے کے لئے
ارضِ کشمیر کی وادیِ جناں بھی کم ہے

۱ مظہر امام: پچھلے موسم کا پھول، ص ۱۲

۲ مکتوب بنام مظہر امام، مرقومہ ۲۷ رجنوری ۱۹۹۲ء، بحوالہ ''نصف مُلاقات'' از۔ ڈاکٹر امام اعظم، ص ۴۷

گر رہے ہیں زرد پتے پیڑ سے فالج کی طرح
وادیٔ کشمیر ہے بیمار کا بستر ابھی

''پالکی کہکشاں کی'' (۲۰۰۰ء) مظہر امام کی عمر بھر کی غزلیہ شاعری کا سرمایہ ہے۔ اِس میں اُنہوں نے ۱۰ آزاد غزلیں اور چند متفرق اشعار بھی شامل کیے ہیں۔ ۲۴۸ صفحات پر مشتمل مظہر امام کی یہ غزلیں اور آزاد غزلیں (کلیات) اس لحاظ سے اپنی ایک خاص اِنفرادیت رکھتی ہیں کہ اس میں مظہر امام کی تمام اَدوار کی غزلیہ شاعری پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس طرح اُردو غزل میں اُن کا مقام اور مرتبہ متعین کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ''پالکی کہکشاں کی'' کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مظہر امام ایک کامیاب غزل گو شاعر ہیں۔ اُن کی غزلوں میں جہاں ایک طرف فلسفانہ اندازِ فکر ہے وہاں دُوسری طرف لہجے کی برجستگی اور تیکھاپن بھی نظر آتا ہے۔ وہ لفظ و معنی کے رشتے سے واقف ہیں، اِس لئے اُن کے یہاں الفاظ کا اِستعمال اِنتہائی بلیغ ہے۔ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور فارسی کے الفاظ بھی اِستعمال کرتے ہیں جن سے اُن کی شاعری میں ایک عجیب وارفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ مظہر امام پرانے اور دقیق الفاظ کو نیا جامہ پہنا کر اپنی غزلوں میں نئے معنی اور مفاہیم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایسے الفاظ کا اِستعمال بھی کرتے ہیں جن سے اُن کی غزلوں میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ اُن کے یہاں ہوا، پانی، دُھواں، آندھی، روشنی، برف، خواب، گرمی، دھوپ، شجر، سایہ، آئینہ، عکس، چنار، آب، دریا، کنکر، آگ، پتھر، آفتاب، جنگل، گھر، مکان، شیشہ، زمین، سمندر وغیرہ جیسے الفاظ کی تکرار سے لفظوں کے نہ صرف معنی بدل گئے ہیں بلکہ اُن کے اِستعمال سے شعر کی نئی جہتیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔

مظہر امام فطرت اور اِنسان دونوں سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں لیکن اِنسان کی ذات سے اُنہیں عشق ہے۔ وہ اِنسان کو ہر زاویہ نگاہ سے ناپنا چاہتے ہیں، اُس کی قوّت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اُس کی فطرت کو جانچنا چاہتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں حُسن اور حیرت زا موسموں کے ساتھ ساتھ اِنسانی زِندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی بھی ملتی ہے اور اِس پر اُن کے مترنم اور شگفتہ بحور سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہیں۔ ''پالکی کہکشاں کی'' کی غزلیں اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہیں۔ اِن غزلوں میں کہیں کہیں خود کلامی کی کیفیت بھی ہے اور ڈرامایت بھی۔ مظہر امام کی بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں رُوح میں آہستہ آہستہ اُترنے والی طنز کی کاٹ بھی ہے اور جذبے کی شدت بھی پائی جاتی ہے۔

مظہر امام چونکہ مختصر بحور میں غزل کہنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے خوبصورت تشبیہات و استعارات کا سہارا بھی لیتے ہیں، جن کی بدولت اُن کی غزلوں میں وُسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اُن کے یہاں بڑی جاندار تراکیب مطالعے میں آتی ہیں۔ اُن کا اسلوب سادہ ہے اِس لئے اُن کے یہاں اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے مانوس اور روزمرہ اِستعمال کے ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن سے اُن کے اَشعار میں ایک نئی جان پیدا ہوگئی ہے۔

مظہر امام کی غزلیہ (کلیات) ''پالکی کہکشاں کی'' کے مطالعہ کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اُن کی شاعری بہت سارے نشیب وفراز سے گزر کر اب ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں نہ صرف شاعر ایسے فکر وفن کی خصوصیات کی وجہ سے اپنے معاصرین میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ اپنے دور کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔

موتی لال ساقی

یادوں کے دریچے سے

ماضی کے دریچے سے جب بھی جھانکتا ہوں تو بہت ساری یادیں الاؤ بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ انہی یادوں میں سے ایک حسین یاد کشمیری زبان کے منفرد انداز کے شاعر، محقق، نقاد اور دانشور مرحوم موتی لال ساقیؔ سے وابستہ ہے۔

جب شعور نے آنکھ کھولی، تھوڑی سی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی تو گھر کی چار دیواری میں بعض ایسے نام سُننے میں آئے جو اکثر ہمارے غریب خانے پر تشریف لاتے تھے اور لکھنے پڑھنے کے کام میں منہمک ہوجاتے تھے یا پھر بحث ومباحثہ میں دِن بھر مصروف رہتے تھے۔ کبھی کبھی جب اُن کی بحث طول پکڑتی تھی تو رات کا پروگرام بھی بن جاتا تھا۔ ان مجالس میں حصّہ لینے والوں میں حکیم منظورؔ، مخمور بدخشیؔ، پشکر ناتھ، وجیہہ احمد اَندرابی، سوم ناتھ بالی پرکاشؔ، محی الدین شالؔ، طاہر مضطرؔ، غلام نبی باباؔ، راج کنول گگوؔ، غلام نبی سائرؔ، موتی لال جیلخانیؔ، پرتھوی ناتھ جیوتشی اور فلم ساز ارن کول کے نام اَب بھی میرے ذہن کے نہاں خانوں میں ڈبکیاں مار رہے ہیں۔ لیکن اُن سب میں سے جناب موتی لال ساقیؔ کا نام اِس لحاظ سے سرفہرست ہے کہ والد مرحوم کے ساتھ آخری دم تک اُن کا ساتھ قایم ودایم رہا۔ باقی لوگ روزگار کے سلسلے میں اِدھر اُدھر بھٹک گئے۔

ساقیؔ صاحب میرے والد محترم آنجہانی ڈاکٹر برج پریمیؔ کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے۔

اُن کی دوستی کا آغاز بڈگام سے سری نگر آنے والی بس میں ڈرامائی انداز میں ہوا تھا۔ یہ دوستی آگے چل کر مستحکم صورت اِختیار کرگئی اور جلد ہی بھائی بندھن کے رِشتے میں تبدیل ہوگئی۔ اس ملاقات کی تفصیل خود ساقی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:-

"....... ۱۹۵۵ء کی ایک شام کو میں بڈگام سے گاڑی میں سری نگر جا رہا تھا۔ اُس زمانے میں سری نگر اور بڈگام کے درمیان دِن میں گاڑی صبح شام ایک چکر لگاتی تھی۔ اُن ہی دِنوں بڈگام کو کمیونٹی پروجیکٹ بلاک کا درجہ دیا گیا تھا۔ دیگر سرگرمیوں کے علاوہ پروجیکٹ کے تحت ہر پنچایت میں چھوٹی موٹی لائبریری قایم کی گئی تھی۔ لائبریریوں کے لئے کتابوں کا اِنتخاب نہایت سلیقے سے کیا گیا تھا۔ آج اُن لائبریریوں کا کہیں نام ونشان نہیں، مگر کتابیں اَب بھی لوگوں کے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ میں بھی اُن لائبریریوں سے پڑھنے کے لئے کتابیں اُدھار لیا کرتا تھا۔ سچ پوچھئے تو میری اِبتدائی تربیت اُن ہی لائبریریوں کی مرہونِ منّت ہے۔ اُس دِن میں ڈھیر ساری کتابیں ہاتھ میں لئے گھر جا رہا تھا۔ گاڑی میں سفر کے دوران میں منتخب اَدب نام کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرے ساتھ سیٹ پر بیٹھا ایک شخص مجھے پڑھتے دیکھ کر چونک سا گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے میرے ساتھ گفتگو کی جو اَدب کی سرحدوں سے نکل کر پھر گھریلو سطح پر آ پہنچی۔ یہ تھی ہماری دوستی کی ابتدا.............."

ساقی صاحب نہایت پُرخلوص اِنسان تھے۔ شرافت، اِنکساری اور دردمندی اُن کو ورثے میں ملی تھی۔ وہ دوستی کے مقدّس رِشتے کو نبھانا جانتے تھے۔ اِسی لئے جہاں کہیں بھی وہ جاتے تھے، دوستوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ گھر میں ہوں یا دفتر میں، بس میں سوار ہوں یا چہل قدمی کرنے کے لئے نکلے ہوں، ہر وقت دوستوں سے محوِ گفتگو نظر آتے تھے۔ وہ یاروں کے یار تو تھے ہی لیکن دُشمن سے دوستی نبھانے کے فن سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ ساقی کی ہر اَدا نرالی تھی۔ وہ جس کسی سے بھی دوستی کا ہاتھ بڑھاتے تھے، اُسے

ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ وہ خلوص ومحبت کا پیکر تھے لیکن اُن سے دوستی کا رشتہ نبھانا بڑا مشکل تھا۔ کیونکہ اُنہیں کھرے اور کھوٹے کی پہچان تھی۔ اُنہیں معلوم تھا کہ کس شخص کے پاس دوستی کا مقدّس رشتہ نبھانے کی صلاحیت ہے۔ اُن کی بے شمار تحریریں اِس بات کی ضمانت دے رہی ہیں کہ اُن کے نزدیک دوستی کا رشتہ کیا معنی رکھتا تھا۔ خود ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

''برج پریمی ـــــــ یہ نام جب بھی زبان پر آتا ہے یا مطالعہ کرنے کے دوران نظر سے گذرتا ہے تو اُس وقت میری آنکھوں کے سامنے ماضی کے تمام اوراق پلٹتے ہوئے نظر آتے ہیں، جن کے حروف میں ہم نے زندگی کے تیس سال ایک ساتھ گذارے ہیں۔ ہم ایسے دوست تھے جن کی معراج دوستی تھی۔ زندگی کے اِس سفر میں ہمارے ساتھ اور بھی کئی لوگ شامل ہو گئے لیکن اُن لوگوں نے ایک ایک کر کے اپنی راہ لی۔ ہم لے دے کر صرف دو ہی رہ گئے۔''

(ساقیؔ صاحب کی ایک کشمیری تحریر کا ترجمہ)

نہ صرف یہی تحریر اُن کی دوستی کی گواہی دے رہی ہے بلکہ والدِ محترم پر لکھے گئے ساقیؔ صاحب کے مضامین اور خاکے اس اَمر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ ایک دُوسرے کے کتنے قریب تھے۔ اِس سلسلہ میں ساقیؔ صاحب کی ایک تحریر ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں:۔

''........برج پریمی میرے لئے صرف دوست نہیں تھا بلکہ شفیق بھائی اور ہمراز تھا۔ میری زندگی میں وہ موسمِ بہار کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور دمِ واپسیں تک گرد و پیش کو مہکاتا رہا........''

ساقیؔ صاحب جب بھی ہمارے گھر آیا کرتے تھے تو والد کی طبیعت باغ باغ ہو جاتی تھی۔ اور پھر آتے ہی اُن کی باتوں کا دفتر کھل جاتا تھا۔ میں نے ہر بار اُنہیں زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا اور یہی قہقہہ اُن کی دمِ واپسیں تک اُن کے ساتھ رہا۔ رات گئے تک مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرنا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکنا دونوں کی مشترکہ عادت بن گئی تھی۔ اُن کی گفتگو رات کے دو تین بجے تک جاری

رہتی۔ اَدب کی باتیں، سیاست کی باتیں، نجی باتیں —— باتوں کا طویل سلسلہ۔ میرے سُپرد اَکثر کچن سے چائے لانے کا کام رکھا جاتا تھا۔ چونکہ اُن دِنوں دونوں بلا کے سگریٹ نوش تھے۔ گفتگو میں محو ہوجانے کے دوران جب رات کے ۱۱ بجے اُن کی سگریٹوں کا اَسٹاک ختم ہوجاتا تھا تو والد مجھے بلاکر سگریٹ کی ڈِبیا لانے کا حکم دیتے تھے اور میں ڈرتے ڈرتے محلے کے کُتوں سے جان بچا بچا کر شب کے سناٹے میں مختلف گلیوں اور کوچوں سے ہوتا ہوا دوکان پر پہنچ جاتا تھا اور سگریٹ کی ڈِبیا خریدا کرتا تھا۔ کتنی دِلچسپ محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ آج کی مصروف ترین زندگی میں ایسی محفلوں کا تصوّر کون کرسکتا ہے؟

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ ساقیؔ صاحب شروع میں ساقیؔ رُومانی کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ اُن کی کئی اِبتدائی تحریریں میرے پاس محفوظ ہیں، لیکن جلد ہی اُنہوں نے موتی لال ساقیؔ کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ جب میں نے اُن سے اُن کے تخلص کے بارے میں اِستفسار کیا تو اُنہوں نے بتایا۔

"تخلص —— اِس کے بارے میں یہی کہوں گا کہ
یہ تخلص مجھے ایک دوست محمد عبداللہ عارجؔ کی دین ہے۔"

موتی لال ساقیؔ ۱۹۳۶ء کو سری نگر کے محلّہ بڈی یار بالا میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پنڈت مدھوسودن راز دان محکمہ پولیس میں سارجنٹ تھے۔ ساقیؔ ابھی دو سال ہی کے تھے کہ اُن کے سر سے والد کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُٹھ گیا۔ اِس طرح سے بچپن سے ہی اُن کی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن ساقیؔ کی نیک سیرت والدہ نے اُس نازک اور بدترین دور کا مقابلہ بہادری سے کیا۔ بڈی یار میں اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں ظلم وستم کا نشانہ بننے کے بجائے ساقیؔ کی والدہ نے بچوں کے ہمراہ اپنے میکے مہانورہ کا رُخ کیا اور تب سے ۱۹۹۰ء تک یہ خاندان مہانورہ میں ہی قیام پذیر تھا۔ ساقیؔ صاحب خود اِس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"........دو سال کا جب میں تھا تو والد اِنتقال کر گیا۔
تو (ہمیں) یعنی (مجھے) اور میری بہن (کو) والدہ کے زیرِ سایہ چھوڑ گئے۔ والد کے اِنتقال کے بعد دو ماہ بعد ہی ہمارے چاچا نے ہم کو گھر سے نکال دیا تو میری والدہ اپنے میکے ہمارے ساتھ چلی آئیں اور وہاں رہنے لگی......"

(والد مرحوم کے نام ساقیؔ صاحب کے ایک خط سے)

ساقیؔ کی والدہ اپنے بیٹے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا خواب ہر پل دیکھا کرتی تھیں۔ اُنہوں نے غربت اور تنگ دستی میں ۱۹۴۳ء میں ساقیؔ کو زوہامہ کشمیر کے پرائمری اسکول میں داخل کروایا۔ یہ ساقیؔ کی خوش نصیبی تھی کہ اُس اسکول میں کشمیر کے ایک عظیم شاعر اور محقق جناب عبدالاحد آزادؔ بحیثیت ایک مدرّس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اِس طرح سے انہیں اس عظیم شاعر اور محقق کا فیض حاصل ہوا۔ جس کا ذِکر وہ بار بار اپنے احباب میں بڑے فخر سے کرتے تھے۔ ایک ملاقات کے دوران اُنہوں نے مجھے بتایا:-

"......۱۹۴۳ء میں زوہامہ کے پرائمری اسکول میں داخلہ لیا اور دُوسری جماعت میں بیٹھ گیا۔ میں اُن خوش نصیبوں میں سے ہوں جن کو عبدالاحد آزادؔ کا شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ جو اُن دِنوں اُسی اسکول میں مدرس تھے............"

ساقیؔ صاحب ابھی پانچویں جماعت میں ہی زیرِ تعلیم تھے کہ اُن پر ایک اور قہر ٹوٹ پڑا۔ اُن کی ہمشیرہ اچانک اِنتقال کر گئیں۔ وہ اُن کی غمگسار، ہم دم اور بہترین دوست تھیں۔ اس حادثے سے اُن کے دِل و دماغ پر زبردست اثر پڑا۔ اُن کے اندر کا شاعر بیدار ہوا۔ ساقیؔ بچپن سے ہی ذہین اور علم واَدب کے شیدائی تھے۔ تعلیم جاری رکھنے کے سلسلے میں اُنہیں نہ جانے کون سے پاپڑ بیلنے پڑے۔ گاؤں میں اُس زمانے میں کوئی ہائی اسکول نہیں تھا۔ لہٰذا اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے اُنہیں گھر سے کوئی ۲۰ رکلومیٹر دُور ہائی اسکول چرارِشریف میں داخلہ لینا پڑا۔ یہ علاقہ کشمیر کے مشہور صوفی، شاعر اور درویش باکمال حضرت نورالدین ولیؒ عرف نُند ریشی کی زیارت کے لئے مشہور ہے۔ اِس طرح سے بچپن سے ہی ساقیؔ کو حضرت شیخ کی شخصیت اور اُن کی شاعری سے دِلچسپی پیدا ہوگئی۔ بعد میں اُنہوں نے اپنی صلاحیت، محنت اور لگن سے حضرت شیخ کی شخصیت اور اُن کے فن پر تحقیق کر کے اُن کی کلیات شایع کی، جس کو نہایت ہی معتبر، مکمل اور مستند کلیات کی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۵۲ء میں اسی اسکول سے اُنہوں نے میٹرک پاس کیا۔ چونکہ گھر میں اَفلاس اور ناداری کے سائے منڈلا رہے تھے، اِس لئے وہ تعلیم کو آگے نہ بڑھا سکے اور دیہات سدھار محکمہ میں گرام سیوک بن گئے۔ لیکن یہاں بھی اُنہیں اِطمینان کا سانس نہ مل سکا۔ والد مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں:-

''.........اور اِدھر بندے کا یہ حال ہے، نہ تو دوستوں کی صحبت، نہ سازگار ماحول اور نہ مستحکم اِقتصادی حالت، کیا کروں؟ ہمارا محکمہ اَب میرے لئے ایک دوزخ بن گیا ہے۔ میرے لئے اِس محکمے میں رہنا بہت ہی کٹھن کام ہے۔ اگر مجھے ایجوکیشن میں جگہ مل جائے اور مجھے لداخ یا جموں کے کسی دُور ہی جگہ بھیجا جائے، میں تیار ہوں.............''

(۲۸ ستمبر ۱۹۵۹ء کے ایک خط کا اِقتباس)

ساقیؔ صاحب بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے سے شغف رکھتے تھے۔ دیہات سدھار محکمہ کی ملازمت میں اگر چہ اُنہیں سکون میسّر نہیں تھا لیکن اِس بات سے اِنکار نہیں کہ پڑھنے لکھنے کے لئے اُنہیں کافی موقعہ میسر تھا۔ اُنہوں نے اُسی دور میں غالبؔ، پریم چند، اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ وغیرہ جیسے اُردو کے قلم کاروں کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان کے معتبر شعراٗ کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ وہ لل دید اور شیخ العالم کے کلام سے کافی متاثر تھے۔ ۱۹۵۴ء میں ساقیؔ صاحب نے ادیب کامل، ۱۹۶۰ء میں ایف۔اے اور ۱۹۶۶ء میں بی۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ کچھ عرصہ کے لئے وہ ریڈیو کشمیر سری نگر میں دیہاتی پروگرام کے رپورٹر رہے۔ اِس کے بعد جموں وکشمیر کلچرل اکادمی میں مستقل طور پر مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ جہاں وہ سالہا سال تک اپنے فرایض منصبی انجام دینے کے بعد اکادمی سے سبکدوش ہوئے۔

جدید کشمیری شعراٗ اور ادباٗ کے کارواں میں ساقیؔ صاحب ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر ہی تھے بلکہ ایک قابلِ قدر محقق، نقاد، مترجم، مرتب اور تبصرہ نگار بھی تھے۔ لوک اَدب اور صوفی شاعری سے نہ صرف اُنہیں دِلچسپی تھی بلکہ وہ ''کاشُر لکہِ باتھ'' (کشمیری لوک گیت) پانچ جلدوں میں، ''کاشُر صوفی شاعری'' (کشمیری صوفی شاعری) دو جلدوں میں اور مشہور صوفی شاعر اور بزرگ ''پرمانند'' دو جلدوں میں ترتیب دے چکے ہیں۔ ان تالیفات کے علاوہ کلیاتِ شیخ العالمؒ مرتب کرنے پر اُنہیں جموں وکشمیر ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے گراں قدر اعزاز سے نوازا گیا۔ ساقیؔ کے تین شعری مجموعے ''موودری خاب'' (۱۹۶۶ء) میں، ''من سر'' (۱۹۷۹ء) میں اور ''نیرِ نغمہ'' (۱۹۹۷ء) میں شایع ہو چکے ہیں۔ ''من سر'' پر اُنہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان تصانیف کے علاوہ ساقیؔ صاحب کی

اور بھی بے شمار تصانیف شایع ہو چکی ہیں۔ جن میں ''ناول کیا گئہ'' ، ''گا شر''، ''اُنکہ ون'' وغیرہ تصانیف بھی شامل ہیں۔ ساقی صاحب کشمیر کے صوفی شاعر صمد میر پر ایک مونوگراف بھی لکھ چکے ہیں۔ جو ساہتیہ اکادمی کی طرف سے شایع ہو چکا ہے۔ اُس مونوگراف کا اُردو ترجمہ میرے والد مرحوم جناب ڈاکٹر برج پریمی نے ۱۹۸۹ء میں کیا اور یہ بھی ساہتیہ اکادمی، دہلی نے اُن کے اِنتقال کے بعد ۱۹۹۰ء میں شایع کیا۔ اِس کے علاوہ ساقی صاحب نیشنل بک ٹرسٹ آف اِنڈیا کے لئے پہلی مرتبہ ''آزادیٔ ہند نغمہ'' (جنگِ آزادی کے نغمے) بھی مرتب کر چکے ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں ساقی صاحب نے وہاب حاجنی پر ایک اور مونوگراف لکھا، جس کی اپنی خاص اہمیت ہے۔ ''اگرنیب'' اُن کا ایک اور تحقیقی وتنقیدی کارنامہ ہے، جو مرکزی سرکار کے اِنسٹی چیوٹ آف لینگویجز میسور (Mysore) کے مالی تعاون سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ ساقی صاحب نے پنڈت جیالال کول کی کتاب ''لل دید کی شخصیت اور فن'' کو بھی اُردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ کتاب ''لل دید'' کو سمجھنے میں مد ثابت ہو سکتی ہے۔ اُردو میں بھی ساقی صاحب کی ایک کتاب ''کشمیر میں سیکولر اِزم'' بہت پہلے شایع ہو چکی ہے اور اس کتاب پر بھی اُنہیں اعزاز سے نوازا گیا۔ ساقی صاحب تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ مختلف ادبی اِداروں سے بھی وابستہ رہے، جن کی تفصیل بہت طویل ہے۔

ساقی صاحب ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نہ صرف ایک قابلِ قدر شاعر ہی تھے بلکہ اُنہیں کشمیر کی تاریخ سے بھی گہری دِلچسپی تھی۔ تحقیق، ترجمہ، ڈرامے، اوپیرا، تبصرے، اَفسانے اور اَدب پارے کون سا ایسا شعبہ ہے جو اُنہوں نے نہ آزمایا ہو۔ وہ انگریزی اور اُردو میں بھی گونا گوں موضوعات پر مضامین لکھ چکے ہیں۔ کشمیری اَدب کی گراں قدر خدمات کے لئے اُنہیں حکومتِ ہند نے ''پدم شری'' کے اعزاز سے نوازا، لیکن اُن کے لئے سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ اُن کی شاعری اور اُن کی نثر لوگوں نے پڑھی، سمجھی اور پسند کی۔ ساقی صاحب بے تکان لکھتے رہے اور اپنے قلم سے عمر بھر موتی رولتے رہے، لیکن اَب اُن کے قلم کی سیاہی سوکھ گئی ہے۔ وہ قلم جس نے وقتاً فوقتاً علمی وادبی دُنیا میں اِنقلاب لایا تھا۔ اَب نہ جانے کیوں دیکھتے ہی دیکھتے خاموش ہو گیا ہے۔ اَب نہ وہ قہقہے بلند ہوتے ہیں اور نہ وہ باتوں کا دفتر کھل جاتا ہے۔ وہ محفل بھی اُجڑ گئی، جو رات گئے تک ہوا کرتی تھی۔

پرتوستان کا شاعر

ـــــ مرغوبؔ بانہالی

کشمیری شعر واَدب کی جہاں وادیٔ کشمیر کی حدود میں رہنے بسنے والوں نے اپنے فن پاروں سے آبیاری کی ہے وہاں خِطۂ جموں سے تعلق رکھنے والے بے شمار ایسے مشاہیرِ اَدب پیدا ہو گے ہیں جنہوں نے اپنی لازوال تخلیقات سے اِس زبان میں خونِ جگر کی آمیزش کی ہے۔ بلکہ اُن کی بدولت ہی کشمیری زبان واَدب نے دُور دُور تک اپنے بال و پر پھیلا دیئے ہیں اور کشمیری نہ بولنے والے علاقوں میں بھی اپنی شاعری سے اپنا سِکّہ جمالیا ہے۔ چنانچہ خِطہ جموں سے تعلق رکھنے والے جن قلمکاروں نے اپنی تخلیقات سے کشمیری شعر وادب میں قابل قدر اضافے کئے ہیں، اُن میں کامگارؔ کشتواڑی، رساؔ جاودانی، نشاطؔ کشتواڑی، جانبازؔ کشتواڑی، بشیرؔ بھدرواہی، شہبازؔ راجوروی اور منشورؔ بانہالی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ مشاہیرِ اَدب کی اِس فہرست میں پروفیسر مرغوبؔ بانہالی کا نام کئی لحاظ سے نمایاں طور پر لیا جا سکتا ہے۔ آپ سالہا سال سے اپنی بے پناہ صلاحیت، محنت اور لگن سے کشمیری شعر وادب کی بے لوث خدمت کرتے رہے ہیں۔

مرغوبؔ ایک شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی، محقق بھی ہیں اور نقاد بھی۔ کشمیریات سے بھی اُن کی گہری دِلچسپی ہے اور اقبالیات پر بھی وہ وقتاً فوقتاً خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک شاعر ہیں اور صنفِ شعر میں بھی اُن کی نثر کی طرح اُن کے گوناگوں موضوعات جلوہ گر ہوتے ہیں۔ مرغوبؔ

کی شاعری میں فکر کی تازہ کاری اور جذبات کی ہم آہنگی ملتی ہے۔ اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُنہوں نے بچپن سے ہی رومیؔ، سعدیؔ، حافظؔ، غنیؔ، غالبؔ، اقبالؔ، شیخ العالمؒ، میر تقی میرؔ اور فیضؔ کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اُن عظیم شاعروں کی رُوحانی صحبت میں ہی مرغوبؔ صاحب کے ذہن کی پرتیں کھل گئی ہیں، اور اُن کی شاعری میں ایک منفرد رنگ پیدا ہو گیا۔

مرغوبؔ کا خاندانی نام خواجہ محمد گیری ہے۔ وہ ۵ / مارچ ۱۹۳۷ء کو بانہال کے ایک دُور دراز گاؤں "برہمن بنکوٹ" کے گیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ شروع سے ہی نہایت خوش حال خاندان رہا ہے۔ اس خاندان کے کسی بزرگ نے کئی پُشت پہلے اِسلام قبول کیا تھا۔ مرغوبؔ کے جدِ اُمجد خواجہ محمد جوٗ گیری، مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں نائب تحصیلدار تھے۔ اِس طرح سے اس خاندان کا شروع سے ہی بانہال اور اُس کے ملحقہ علاقوں میں بڑا دبدبہ رہا ہے۔ مرغوبؔ کے دادا جان اپنے علاقے کے سر کردہ تاجروں میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کے والدِ بزرگوار خواجہ اَسد اللہ گیری نے بھی اِسی پیشے سے دِلچسپی لینا شروع کی اور عمر بھر اپنے اسی خاندانی پیشے کو وُسعت دیتے رہے، اَلبتہ اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک مذہب پرست اور دیندار بزرگ ہونے کا ساتھ ساتھ نماز اور روزوں کے پابند تھے۔ مرغوبؔ اپنے خاندان کی مزید جانکاری فراہم کرتے ہوئے میرے ایک اِستفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:-

> "......ہمارے آبا "برہمن بنکوٹ" نامی گاؤں میں کئی پُشت پہلے اِسلام قبول کرنے کے بعد بھی چند سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ چنانچہ میرے والد صاحب خواجہ اَسد اللہ گیری کے دادا جان خواجہ محمد جوٗ گیری، مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں نائب تحصیلدار تھے۔ اَلبتہ میرے دادا جان علاقے میں ایک بڑے تاجر (ہول سیلر) بن کر چھا گئے اور میرے والد نے اُس کاروبار کو مزید وُسعت دی تھی۔"[1]

مرغوبؔ بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے سے شغف رکھتے تھے۔ اُن کے والد اگر چہ تجارت پیشہ تھے لیکن اَدب سے اُن کی دِلچسپی کم نہیں تھی۔ مرغوبؔ نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو اُنہیں مقامی اسکول میں داخل

[1] مرغوبؔ صاحب کے ایک خط کا اقتباس

کرلیا گیا۔ ابھی اِبتدائی تعلیم کے مراحل بھی طے نہ کر پائے تھے کہ اُن کے والد اِنتقال کر گئے۔ اِس طرح سے گھر گرہستی کا سارا بوجھ اُن کے کندھوں پر آن پڑا، لیکن پڑھنے کی طرف اُن کی دِلچسپی کبھی کم نہیں ہوئی۔ ۱۷ سال کی عمر میں میٹرک کا اِمتحان پاس کرنے کے بعد وہ بانہال کے ایک دُور اُفتادہ پہاڑی مقام کے پرائمری اسکول میں بطورِ اُستاد تعینات ہوئے اور یہیں سے اُن کی جدو جہد کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ لیکن اُنہوں نے کبھی اپنی خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اپنے خاندانی وقار کو برقرار رکھا۔ اس کے ایک سال کے بعد مرغوبؔ نے نہ صرف آنرز۔ اِن۔ پرشین (منشی فاضل) کا امتحان اِمتیاز سے پاس کیا، بلکہ ڈِپلوما اِن ٹیچنگ (D.T) کی ٹریننگ میں بھی اچھے نمبرات حاصل کئے۔ چنانچہ اگلے دو برسوں کے اندر ایف. اے اور بی. اے پاس کرنے کے بعد B.ED کی ڈِگری بھی حاصل کی۔ وہ قلیل مُدّت تک ہائر سکنڈری اسکول بانہال میں وائس پرنسپل کے فرایض بھی انجام دیتے رہے۔ مرغوب برس ہا برس تک تحصیل ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ فارسی زبان سے بے پناہ شغف کی وجہ سے اُنہوں نے فارسی میں ایم.اے کی ڈِگری پہلی پوزیشن میں حاصل کی۔ اس کے بعد شوقِ مطالعہ نے اُنہیں بانہال سے سری نگر کا رُخ کرنے پر مجبور کیا۔ سری نگر جیسے شہر میں مرغوبؔ کو تحقیقی مراحل طے کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنا پڑے۔ اُنہیں طرح طرح کی مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے کُنبے کا چلانا اور اُس کی رہبری کرنا بڑے دِل گردے کا کام ہے، لیکن مرغوبؔ نے اُن تمام دُشوار گذار مراحل کو خوش اُسلوبی سے طے کر کے اپنے تحقیقی اور اَدبی کام کو جاری رکھا اور تادم تحریر خُدا کے فضل وکرم سے وہ اپنے تحقیقی کام میں مُنہمک ہیں۔ مرغوبؔ اپنی زندگی کا مختصر ساخاکہ کچھ اِس طرح پیش کرتے ہیں:۔

"..... ۱۷ سال کی عمر میں میٹرک پاس کرنے کے بعد ایک دُور افتادہ پہاڑی علاقے میں پرائمری اسکول میں ٹیچر بن گیا۔ لیکن اگلے سال نہ صرف آنرز پرشین (منشی فاضل) میں پہلی پوزیشن حاصل کرلی بلکہ ڈپلوما اِن ٹیچنگ (.D.T) نام کی ٹریننگ میں بھی اچھے نمبرات حاصل کئے۔ چنانچہ اگلے دو سال کے اندر اندر ایف.اے اور بی.اے پاس کرنے کے بعد جلد ہی B.Ed بھی کرلیا اور کچھ دیر ہائر سکنڈری اسکول بانہال میں وائس پرنسپل رہنے کے بعد ۲۵ سال کی

عمر میں ہی محکمہ تعلیم میں گزیٹڈ آفیسر بن گیا۔ پھر چند سال ایک مقبول تحصیل ایجوکیشن آفیسر بن کر رام بن تحصیل میں کام کرنے کے بعد اُس افسری کو اپنے شوقِ مطالعہ پر قربان کر دیا اور ایک بڑے عیال کے سمیت تمام جائیداد چھوڑ کر سری نگر پہنچ گیا اور اِنتہائی مالی مشکلات کے باوجود نو بچوں کی مناسب پرورش اور تربیت کے ساتھ ساتھ تخلیقی کام میں بھی امتیازات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اللہ کے فضل سے تقریباً ہر کوشش تیر ہدف ثابت ہوگئی۔" [1]

۱۹۶۹ء میں مرغوبؔ صاحب کا شعبہء فارسی کشمیر یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر تقرر ہوا۔ یہاں اُنہیں کشمیری زبان کے سر برآوردہ ادباً پروفیسر رحمٰن راہیؔ اور پروفیسر کے. این. پنڈتا کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا۔ ان دِنوں صدر شعبہء فارسی پروفیسر شمس الدین احمد تھے۔ وہ مرغوبؔ صاحب کی صلاحیتوں سے واقف تھے، اُن کی حوصلہ افزائی اور رہبری سے مرغوبؔ صاحب کو بہت کچھ سیکھنے کا موقعہ فراہم ہوا۔ یہیں سے اُن کے نظریات میں تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ شعبہ میں اپنے فرائضِ منصبی انجام دینے کے دوران اُن کی ملاقات اُردو اور کشمیری زبان کے بے شمار سر کردہ ادیبوں اور دانشوروں سے ہوئی۔ جن میں دینا ناتھ نادمؔ، پی. این. پُشپؔ، کمال الدین شیداؔ، غلام نبی فراقؔ، علی محمد لون، غلام نبی خیالؔ، امین کاملؔ، موتی لال ساقیؔ، اختر محی الدین، محمد یوسف ٹینگ، برج پریمیؔ، مظفر عازمؔ، چمن لال چمنؔ، حامدیؔ کاشمیری، تنہاؔ انصاری، مرزا عارفؔ، شبہہ زورؔ کاشمیری، قاضی غلام محمد وغیرہ شامل ہیں۔ اُن تمام مشاہیر اُدب کی تنقید و تحقیق سے مرغوبؔ کے فن نے ترقی کے نئے منازل طے کرنے شروع کئے۔ ان کی شاعری پر غور و فکر ہونے لگا اور اُن کے فن کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ اِس کے علاوہ مرغوبؔ صاحب اپنی تخلیقات سے اُن غیر ریاستی ادیبوں اور دانشوروں کو بھی وقتاً فوقتاً محظوظ کرتے رہے، جو ریاست کے مختلف ادبی اور ثقافتی اداروں اور یونیورسٹیوں اور کالجوں سے وابستہ تھے۔ اِس سلسلے میں پروفیسر آلِ احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، مظہر امام،

---

[1] راقم السطور کے نام مرغوبؔ صاحب کا ایک خط

عصمت چغتائی، پروفیسر عالم خوندمیری، زبیر رضوی اور رتن سنگھ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان سربرآوردہ ادیبوں اور قلمکاروں نے مختلف سمیناروں اور مشاعروں میں مرغوبؔ صاحب کے فن کی داد دی۔ اِس طرح سے اُن کا فن زینہ بہ زینہ مختلف مراحل طے کرتا ہوا ایک خاص منزل تک جا پہنچا، جو اُن کی ایک الگ اور منفرد پہچان بن گیا۔ اِسی دوران اُنہوں نے ۱۳۳۹ء سے ۱۵۵۵ء تک تخلیق ہوئے فارسی اَدب پاروں کا تنقیدی تعارف اور کشمیر کی تین سو سالہ ثقافتی تاریخ کا جایزہ پیش کر کے کشمیر یونیورسٹی سے پی.ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی تمنا کا اِظہار علاّمہ اِقبالؔ نے شاعر کشمیر مہجورؔ اور فوقؔ کے نام ایک جیسے خط میں کیا تھا۔ یہ مقالہ ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ پروفیسر شمس الدین احمد، مرغوب صاحبؔ کے اس تحقیقی مقالے کو فارسی اَدب کا ایک بنیادی تحقیقی کارنامہ تصوّر کرتے ہیں۔ وہ مرغوبؔ صاحب کے اِس تحقیقی کارنامے سے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:-

> ''......شری غلام محمد مرغوبؔ کی لکھی ہوئی تھیسس کشمیر میں فارسی اَدب کے ایک مایہ ناز دور سے متعلق ایک بنیادی تحقیقی کارنامہ ہے۔ فاضل مصنّف نے فارسی ادب کے اُس زمانہ کے ابھی تک نامعلوم پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے اور اُس زمانہ کے کچھ نایاب مخطوطات کا تنقیدی انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ اُنھوں نے معتبر حوالوں کے ساتھ شاہمیری دور کے شاعروں، عالموں، نثر نگاروں، ترجمہ کاروں، حکیموں اور قواعد شناسوں کے بارے میں تفصیلات فراہم کرتے ہوئے اپنے تحقیقی کارنامے کو زیادہ اَہم بنادیا ہے۔ اُنہوں نے واقعی اُسی طرح محنت کی ہے جس طرح تحقیق سے شغف رکھنے والے کو کرنا چاہیئے۔''[1]

اُنہی دِنوں کشمیر یونیورسٹی میں سنٹرل ایشین اَسٹڈیز کا شعبہ قائم کیا گیا تو مرغوبؔ صاحب اپنی محنت لگن اور صلاحیت کی وجہ سے ــــ اسی شعبے میں ریڈر مقرر ہوئے۔ یہاں بھی وہ کئی سال تک اِنتہائی لگن سے علمی وادبی کام میں منہمک رہے۔ اُنہوں نے ''مرغوبؔ تھیوری'' کے نام سے ایک قابلِ قدر

---

[1] بحوالہ ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت ، از۔ اسیر کشتواڑی ، ص۔ ۴۶۲

تصنیف لکھی، جو کشمیری رسم الخط کو آسان بنانے اور اس کو صحیح سمت میں لانے کے لئے ایک خوش آیندہ قدم ہے۔

مرغوبؔ صاحب کشمیری زبان سے بے حد محبت کرتے ہیں اور اِس کے دامن کو کشادہ بنانے کے متمنی ہیں۔ اُنہیں کشمیر کی تاریخ، کلچر اور ثقافت عزیز ہے۔ یہی دِلچسپی اور لگن اُنہیں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ کشمیری کی طرف کھینچ لائی۔ وہ ایک عرصہ تک اس شعبہ کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ مرغوبؔ صاحب اس عہدے پر فایز رہنے کے دوران شعر وادب کی بے لوث خدمات انجام دیتے رہے حالانکہ یہ دور کشمیر کی تاریخ میں بدترین دور رہا ہے۔ ۱۹۹۰ء کو کشمیر میں رونما ہوئے دہشت گردی کے واقعات کون بھول سکتا ہے؟ ان واقعات نے جہاں کشمیر کے تاریخی اور ثقافتی وِرثے کو نقصان پہنچایا، وہاں تعلیمی اِدارے اور لائبریریاں خاکستر کر کے کشمیر کی نئی نسل کو تعلیمی لحاظ سے مفلوج کر کے رکھ دیا گیا۔ ان حالات میں بھی مرغوبؔ صاحب نے شعبہ میں اَدبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اُنھوں نے مختلف موضوعات پر سیمناروں کے علاوہ مشاعرے اور مذاکرے منعقد کروائے۔ غرض کہ وہ ایک نڈر اور بے باک اِنسان کی طرح اپنی علمی وادبی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل رہے۔ طلباً کو اُن سے گہری عقیدت اور اُنہیں طلباً سے گہری محبت رہی۔ طلباً کو اِنصاف دِلانے اور اُن کا تعلیمی معیار قایم رکھنے میں مرغوبؔ صاحب ہمیشہ پیش پیش رہے۔

مرغوبؔ صاحب اِبتدأ سے ہی شعر وادب سے دِلچسپی رکھتے تھے۔ اِس لئے وہ بچپن سے ہی کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ اُنہیں طرح طرح کے مصایب اور پریشانیوں نے شروع سے ہی گھیر لیا تھا۔ اپنے والد کے اِنتقال سے اُن کی زندگی میں محرومی اور بے سروسامانی کا جو عالم پیدا ہو گیا تھا، اُس نے اُن کی زندگی میں ایک بہت بڑا خلاٗ پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے سب سے پہلے اپنی یتیمی کو ہی اپنا موضوع بنایا۔ ایک جگہ اپنی محرومی کی داستاں یوں بیان کرتے ہیں:۔

ظاٗلمن ہٮ۪نزٕ ژٕنجہ کھیٚیہٕ کھیٚیہٕ کس ژٕناژھاران یتیم
نٹھ ووہ تھان عرش عظیٖمس اوش چھُہ ییلہٕ ہاران یتیم

(زمانے کے ٹھوکر کھا کھا کر نہ جانے بے چارہ یتیم بے سروسامانی کی حالت میں کس کی تلاش میں

دردر بھٹکتا ہے۔ تھک ہار کے جب وہ ہر طرف مایوسی کے گھنے بادل اپنے چاروں اور دیکھتا ہے تو اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اُن آنسوؤں میں اِتنی تاثیر ہوتی ہے کہ عرش بھی تھرتھراہٹ سے کانپ اُٹھتا ہے)

مرغوبؔ شروع میں اُردو میں شعر کہتے تھے لیکن بعد میں وہ کشمیری زبان میں شعروشاعری کا جادو جگانے لگنے اور اِس میں اَندر کی بات برجستہ اور برمحل اَنداز میں کہنے لگے۔ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ اپنے تخلص کے بارے میں میرے ایک اِستفسار کے جواب میں لکھتے ہیں۔

> ''.....نوویں جماعت میں پٹن سے آئے ہوئے مولوی غلام محی الدین کرمانی، فارسی ٹیچر نے مجھے دیکھا تو کہا اِس چھوٹی عمر میں تمہاری عبارت بھی مرغوب ہے اور تمہارا دستخط بھی مرغوب۔ گویا تم ایک مرغوبِ خاطر طالب علم ہو۔ اِس لفظ کی یہ تکرار مجھے اتنی اچھی لگی کہ بعد میں اِس لفظ کے معنی دیکھ کر اسی لفظ کو اپنا تخلص بنانے کا عزم کیا۔'' [1]

''پرتوستان'' کے نام سے مرغوبؔ کا اوّلین شعری مجموعہ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ اِس مجموعے میں اُن کی غزلیں، نظمیں اور گیت سب کچھ شامل ہیں۔ مرغوبؔ کی شاعری میں پیر پنچال کی برف کی چوٹیوں کی طرح رُوح کو فرحت بخشنے والی تازگی ملتی ہے۔ ''پرتوستان'' کی علامت پر غور وفکر کرنے سے ہی مرغوبؔ کی شاعری کی پرتیں کھل جاتی ہیں اور قاری پُر اَسرار دُنیا میں کھو جاتا ہے۔ مرغوبؔ کی شاعری میں کوئی تصنع نہیں اور نہ اِس میں کوئی پُرکاری ہے۔ بلکہ اُن کی شاعری سیدھی سادی شاعری ہے جس میں شاعر کے جذبات اُمنڈ آئے ہیں۔ جہاں تک مرغوبؔ کی غزلوں کا تعلق ہے۔ یہ غزلیں اپنے کنوارے پن کی وجہ سے دِلکش و دِلگداز معلوم ہوتی ہیں۔ اِن میں جگہ جگہ معصومیت ٹپکتی ہے اور یہی معصومیت اُن کے فن میں تازگی اور توانائی پیدا کرتی ہے۔ مرغوبؔ حسن وعشق کے متوالے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں کوئی بناوٹ نہیں بلکہ اُن کا حُسن خالص کوہستانی حُسن ہے، جہاں ابھی شہر کے بناوٹی حُسن کا پرتو نہیں پڑا ہے۔ بلکہ یہ حُسن آلودگی سے پاک ہے۔ عشق کا معاملہ بھی خالص پہاڑی ہے۔ اِس طرح کے حُسن وعشق کے اِمتزاج نے مرغوبؔ

[1] مرغوبؔ صاحب کے ایک خط کا اقتباس

کی شاعری کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ کشمیری زبان کے ایک محقق اور نقاد ڈاکٹر مشعل سلطانپوری، مرغوبؔ کی غزل کا جایزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

''......مرغوبؔ بانہالی کی غزل میں ایک خاص قسم کا رَبطہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ہلکی سی چنگاری بھڑک رہی ہے۔ لیکن جب اس کا بغور جایزہ لیں تو یہ آگ ہی آگ برساتی ہوئی لگتی ہے۔ کنواری تشبیہہ، صاف وشفاف کشمیری زبان اور حقیقی جذبہ برتنے میں مرغوبؔ حقیقی معنوں میں بے مثال ہیں''۔ [1]

(کشمیری سے ترجمہ)

مرغوبؔ صاحب کے مجموعے ''پرتوستان'' میں ایسی بے شمار مثالیں نظر آتی ہیں، جن سے ڈاکٹر مشعلؔ سلطانپوری کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً

اَچھن میانین چھُو لیکھتھ خون ہارن
بُمن چانین چھُو مشکل مانہِ ژارُن

(اے میرے محبوب تمہارے اَبرو اِتنے معنی خیز ہیں کہ اُن سے مطلب اَخذ کرنا بڑا دُشوار گذار مرحلہ ہے۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ ان سے ہم کلام ہوجاؤں لیکن افسوس کہ ہردم ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اَب میں بےبس ہوں اور روتا رہتا ہوں۔ شاید میری قسمت میں رونا اور خون کے آنسو بہانا ہی لکھا ہوا ہے)

نظرا بہارٕ ددونس میأنس تہٕ کرِکھ زٕ ہے
پوشہ کونڈے رُنیمتس ہلمس ژٕ برِتھ زٕ ہے

(اے بہاروں کی ملکہ، کاش تم میرے دامن میں رنگ بھرنے کے لئے آتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ کاش تم کانٹوں سے ہی میرا پھٹا ہوا دامن بھرتے تو مجھے زندہ رہنے کا حوصلہ مل جاتا۔ میں اُن کو خوشنما پھول سمجھ کر اپنے دامن میں چھپالیتا)

یتھ نورٲنی بستی منز
کمیٚو گٔیہ کارک پرٕچم کھول

(رنگوں اور روشنیوں سے مزین اِس خوبصورت بستی میں نہ جانے کس نے ظلم وتشدد کا بازار گرم کرکے خونی

---

[1] سون اُدب (ناشر جموں وکشمیر کلچرل اکادمی، سری نگر) سنہ اشاعت ۱۹۷۲ء ص

پرچم بلند کیا ہے)

مرغوبؔ کی غزل کی ایک اور اِمتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں روایت کے ساتھ ساتھ جدیدیت کا اِمتزاج بھی ملتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے جہاں لل دید اور شیخ العالم کے فن پاروں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، وہاں وہ رسول میرؔ، مہجورؔ، آزادؔ، رسا جاودانی اور دینا ناتھ نادمؔ کی شاعری سے بھی محظوظ ہوئے نظر آتے ہیں۔ مرغوبؔ اگرچہ جدید شعری رُجحان کے قایل ہیں لیکن ایسی جدید شاعری کے ہرگز دِلدادہ نہیں جس میں آج کے مشینی سماج کی طرح دِلی جذبات کی تمازت کے بجائے دماغی وَرزش اور لفاظی ملتی ہے۔ البتہ جس جدید شاعری میں اعلیٰ اَدب تخلیق کرنے کی قوّت ہو، مرغوبؔ صاحب ایسے شعری ادب کا احترام کرنے میں رطب اللّسان ہیں۔ مرغوب کی غزل میں عصر حاضر کے اِنسان کا درد و کرب جس طرح سے اُبھرتا ہے، وہ اُن کی فکر کے نئے دروازے وَا کرتا ہے۔ صاف اور سلیس زبان، امیجری اور حقیقت آمیزی' یہی چیزیں اُن کی غزلیہ شاعری کی شان ہیں۔ مثلاً جب وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں کہ ؎

زانہِ خودائی ڈیت سگ اپزس

ژتہٕ بہٕ چھ ڈ وِنوسے پنز رس مٲئل

(خدا ہی جانتا ہے کہ کس نے جھوٹ کو حقیقت میں تبدیل کیا ہے۔ ہم دونوں نے سچ بولنے کا راستہ اپنا لیا تھا اور اِسی پر عمر بھر قائم رہے)

چُھ تارکھ ژان کتھ جلاس خبر چھا

پگاہ یُور یُن کس چُھ ساس خبر چھا

(نہ جانے کیوں آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں میں بھی تھرتھراہٹ پیدا ہوگئی ہے۔ معلوم نہیں کل کس کے لئے یہاں دعوتِ شیراز کا اہتمام ہو رہا ہے)

مرغوبؔ کے خیالات میں وُسعت اور ہمہ گیری ہے۔ اُن کی سوچ حقیقت پسندانہ ہے۔ اُن کا لہجہ صاف اور سلیس ہے۔ وہ مختصر بحور میں شعر کہنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ مختصر بحور میں حقیقی اور گہری بات کہنا مرغوبؔ کی شاعری کا خاصا رہا ہے۔ دیکھئے وہ اپنے اَشعار سے کس طرح گل اَفشانی کرتے ہیں:-

؎ مٔژر چھ یاونس ... لاکانٛہِ ... گٔیہ

ے کمال چانہ شفقتک مزار میٹرٕیہ گلٕ پھولن

ے ژھوکس تہ گاشہ تارکس چھ پرزلینس کُنے عمل

ے یاگو ژالکھ توندرکٕ تاوٕ تہ بٕل کیاہیون لرٕ ہندناوٕ

مرغوبؔ کی نظموں میں بھی اُن کی غزلوں کی طرح وُسعت، ہمہ گیری اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ یہ نظمیں قاری کے ذہن پر دیرپا اثرات چھوڑتی ہیں اور اندورنی وحدت رکھتی ہیں۔ مرغوبؔ کی نظموں کے موضوعات رُومانی بھی ہیں اور اِنقلابی بھی، نیچرل بھی اور فلسفیانہ بھی۔ اُن کی اِن تمام نظموں میں جہاں ایک طرف ندرت پائی جاتی ہے وہاں دُوسری طرف ان میں خیالات کی پاکیزگی، بیان کی شگفتگی، سلاست اور روانی بھی ملتی ہے۔ کشمیری زبان کے معروف شاعر، نقاد اور محقق جناب موتی لال ساقیؔ، مرغوبؔ کی شاعری کے اِن اوصاف کے پیشِ نظر ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> ''اُن کی شاعری میں چندر بھاگا (چناب) کی روانی اور کوہستانی پھولوں کی شگفتگی اور سادگی ہے۔ یہ شاعری آج کل کے اِنسان کو فرحت بخشتی ہے۔ اُن کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے قدرت کے نئے نئے رنگ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ مخصوص ڈِکشن اور رنگ مرغوبؔ کی شاعری کا طرۂ اِمتیاز ہے۔'' [1]
>
> (کشمیری سے ترجمہ)

میرے خیال میں ساقیؔ صاحب نے مرغوبؔ کی نظموں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اِظہار کیا ہے کیونکہ مرغوبؔ کی نظموں میں اُن کا مخصوص رنگ، اُن کی سادگی اور صفائی اور قدرت کے انوکھے رنگ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

''پرتوستان'' کے آغاز میں مرغوبؔ صاحب کا سرنامہ ملتا ہے۔ یہ نظم کے فارم میں ہے اور اِس میں وہ ''پرتوستان'' کے فن کے بارے میں منظوم اِظہار خیال کرتے ہیں۔ دیکھئے اپنے نظریہ شعر کے بارے میں وہ منظوم اِظہار کن الفاظ میں کرتے ہیں:۔

جود ونساٸ کُنہٕ کرامتھ چھمنہ امہ تھزرٕچ خبر
کیاہ ونے دِل زہرٕ کانٛہ آیٔن تھاوُن چھُ فن

---

[1] کاشُر، از موتی لال ساقیؔ، ص ۱۹۷۴ء

یُس نہ لفظن منز یوان سُے رمزِ مرغوبس کلام
اکہ اپھولہِ سوٚمنک مُشک زٕھٹہِ دِن چمن چھاوُن چھُ فن

مرغوبؔ کی بیانیہ شاعری میں دٕے، دُنِ یا، کشیٖر، عشقٕنٛ ویداکھ، چوٚن یاوٚن اور برجستہ وغیرہ قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ دٕے یعنی خدا ——— جو کائنات کا خالق ہے، جس کے دم سے دُنیا کا نظام قایم ہے۔ جو شب کے سناٹوں میں خمار پیدا کرتا ہے اور دِن کے اُجالے میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ پھولوں کو مہک اور تازگی عطا کرتا ہے اور آسمانوں میں وُسعتیں پیدا کرتا ہے۔ اُسی کے نام سے اِنسان اپنے دِن کا سفر شروع کرتا ہے اور اُسی کے نام پر اپنا سفر ختم کر کے اَگلے دِن کے پڑاوٗ کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے۔ اِن تمام باتوں کا اظہار مرغوبؔ صاحب نے اپنی اِس نظم میں کیا ہے، کہتے ہیں:۔

ہی تھر سیاہ راتھن منز سُے خمار بخشان
گلِ آفتاب لنجہ یُس تاپک امار بخشان
سُے وٚنلہ دار بالس زٕنہ گاشہ ڈیٹہ شیران
سُے پانہ صاف ناگس ہل بے شمار بخشان
گاہ اوبر لونچہ مُغر تھٕوُ زہلہ چھکان سُہ آبن
گاہ اَدٕی ناش گمستن نو اعتبار بخشان

جیسا کہ پہلے ہی ذِکر ہو چکا ہے کہ مرغوبؔ صاحب کشمیر کی تاریخ، اس کی تہذیب وتمدن اور اس کے کلچر سے گہری واقفیت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ اُن کی نظم ’’کشیٖر‘‘ اِسی جذبۂ عقیدت کی غماز ہے۔ کشمیر کو مرغوبؔ فطرت کے قلم سے کھینچا ہوا ایک بہترین شاہکار قرار دیتے ہیں۔ جہاں رنگ برنگے پھولوں سے لدے ہوئے باغات ہیں، سرسبز اور شاداب کھیت اور جھر جھر کرتے ہوئے آبشار ہیں۔ مرغوبؔ صاحب کشمیر کو علم ودانش اور عقل وعرفان کا منبع قرار دیتے ہیں۔ یہاں صاف وشفاف پانی سے بھری ہوئی جھیلیں ہیں جن میں دُور تک کنول کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں کے چپے چپے پر للّ دید کا اخلاص اور علمدار کا عرفان جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہاں بڈشاہ نے ہمارے ذوقِ جمال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تعمیراتی سرگرمیوں میں ایک نیا جوش لایا اور حبہ خاتون جیسی شاعرہ نے عظمت کے گیت گائے۔ مرغوبؔ کے نزدیک کشمیر جنت کا ٹکڑا ہے۔ اِس کی خوبصورتی اور اِس کے حسن کی مثال دُنیا میں کسی جگہ نہیں ملتی۔ اِن تمام جذبات کا اِظہار

وہ اپنی نظم ''کشیر'' میں جس انداز سے کرتے ہیں وہ انداز اُن کی صلاحیت، لگن اور اِنسان دوستی کا آئینہ ہے۔ مثلاً:-

سائنس ڈلس منز پرٛوتھزٕر پاک پمپوشو
وٕنہ پاک اَیحساسس چھ نگہبان وطن سون
للہ ماجہ ہنٛد اخلاص، علمدار سُند عرفان!
رتہ بدلہ رگن منز چھ وٕنہ للوان وطن سون
معمار چھ بڈشاہ سائنس ذوقِ جمالس
فن کار حبہ خاتونہ ہنز کنوان وطن سون!

''پرتوستان'' کا ایک حِصہ آزاد نظموں پر بھی مشتمل ہے۔ یہ نظمیں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء تک لکھی گئی ہیں۔ اِن نظموں کا تانا بانا بھی ہمارے سماجی حالات، سیاسی اَفراتفری اور معاشی بدحالی ہے۔ یہ نظمیں اپنی ایک خاص تاثیر رکھتی ہیں۔ مرغوبؔ صاحب سطحیت اور نعرہ بازی پر یقین نہیں رکھتے بلکہ وہ فکری اور فنی دونوں سطحوں پر شاعری کو وقار بخشنے کے دَر پے ہیں۔ اُن کی نظموں میں یہ خصوصیت جا بجا ملتی ہے۔ اُن کی آزاد نظمیں بھی آلودگی سے پاک ہیں۔ اُن میں بھی فکر و فن کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔

''ژندرباگا یہ ہندس بتھس پیٹھ'' کے عنوان سے ''پرتوستان'' میں جو نظم ملتی ہے۔ وہ مرغوبؔ کے فکر و فن کے نئے دروازے وَا کرتی ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے اور کشمیری شاعری کی طویل نظموں کی تاریخ اِس نظم کے ذِکر کے بغیر نامکمل ہے۔ اِس کا مرکزی خیال فلسفۂ حیات ہے اور بقولِ پروفیسر پی۔ این۔ پُشپ:-

''......اگر مرغوبؔ صاحب نے ''ژندرباگا یہ ہندس بتھس پیٹھ'' کے عنوان سے صرف ایک ہی نظم تخلیق کی ہوتی تو پھر بھی میں اُنہیں ایک نظم نگار شاعر کا درجہ دیتا۔'' پروفیسر پُشپ کا یہ قول اِس بات کی دلالت کرتا ہے کہ مرغوبؔ صاحب گہرا شعری ادراک رکھتے ہیں اور وہ اپنے فن کی خونِ جگر سے آبیاری کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:-

کانٛہہ اَڈ وتہ پٕنیے تن یا تھکر تن کانٛہہ پُوشتھ ہیکہ تن متہ ہیکہ تن
کانٛہہ پکٕرتن برٛونٛہہ یامتہ پکٕرتن خود سر چھ خودی ہنٛد تاوٕ پکان
دن روز ژٕیمی چکہ جاوٕ پکان

''پرتوستان'' میں چند مختصر ترین نظمیں اور دو تصویری نظمیں بھی خصوصی توجہ کی حامل ہیں۔ مختصر نظموں کا تجربہ کوئی نیا تجربہ نہیں۔ مرغوبؔ سے پہلے بہت سارے شعرا سامنے آئے ہیں جنہوں نے مختصر نظموں کی تاریخ میں اپنا نام نمایاں طور پر لکھوایا اور اِس صنف میں چار چاند لگا دیئے۔ مرغوبؔ کے ہم عصر شعرا میں دینا ناتھ نادمؔ، راہیؔ، کاملؔ، چمنؔ اور ساقیؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے مختصر نظموں میں اپنے فکر و فن کی بالیدگی سے وُسعت عطا کی۔ مرغوبؔ نے بھی اپنے قلم کی جولانی سے اپنے ہم عصروں کی اِس روایت کو آگے بڑھایا۔ اُنہوں نے مختصر نظموں کو ایسے علائم سے مزّین کیا کہ بے شمار پیکر سامنے آتے ہیں۔ الفاظ کا موزوں اِنتخاب، اُن کا برجستہ اور بلیغ اِستعمال، مرغوبؔ کی مختصر نظموں کا خاصا رہا ہے۔ اِس طرح سے ان نظموں میں تنوع اور جدّت پیدا ہوگئی ہے۔ ہانگلؔ، اصلاح، منصوبہ، احساس، ٹیپ، فوٹو، بزم وغیرہ صرف چند نظمیں ہیں جن سے اُن کی فنکارانہ چابکدستی اور اُن کی صلاحیت کا بھرپور اَندازہ ہوتا ہے۔

تصویری نظموں کا تجربہ بھی مرغوبؔ کی جدّت پسندی کا غماز ہے۔ اس طرح کے تجربے کشمیری شاعری کی تاریخ میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ یہ نظمیں بھی مرغوبؔ کی کمالِ فنکاری کی دلیل پیش کرتی ہیں۔

مرغوبؔ کا فن بھی توجہ کا طالب ہے۔ اِس پر غور کیا جائے تو اِس میں بھی اُن کی محنت، لگن اور صلاحیت جگہ جگہ ٹپکتی ہے۔ مرغوبؔ نے بعض جگہوں پر کشمیری محاورات کا استعمال کیا ہے وہ اُن کی شاعری کو ایک اور اِمتیاز عطا کرتے ہیں۔ منفرد اور خوشنما اِستعارات جس طرح مرغوبؔ نے اپنی شاعری میں جذب کئے ہیں، وہ ان کے فنکارانہ شعور کی غمازی کرتے ہیں۔ خالص کشمیری علایم اور تراکیب نے بھی اُن کی شاعری میں نئے اور انوکھے رنگ بھر دیئے ہیں۔ ان میں سے بعض علایم اور تراکیب کو اُنہوں نے خوبصورت اَلفاظ کے قالب میں ڈھال کر اپنے اشعار میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ مرغوبؔ کی شاعری میں خالص کشمیری پھولوں، رنگ برنگے پرندوں، جانوروں، ندی نالوں اور پہاڑوں، شاعروں، صوفیوں، یہاں کے موسموں اور یہاں کے سازوں کا ذکر ملتا ہے۔ موختہ، بادام، ہانگلؔ، ششتر گانٹھ، بہار، نشاط، ٹُھ ون، سونتھ، وژن وغیرہ خالص کشمیری علائم ہیں، جنہیں مرغوبؔ نے اپنی شاعری میں مؤثر طریقے سے اِستعمال کیا ہے۔

''پرتوستان'' کے بعد مرغوبؔ صاحب کی شاعری ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ

مختلف رسائل کے اَوراق میں بکھری پڑی ہے۔ یہ شاعری ''پرتوستان'' کی شاعری کے تسلسل وتوسیع کے باوجود مختلف ہے اور اپنی ایک الگ اِنفرادیت رکھتی ہے۔ جب یہ سارا کلام شعری مجموعے کی صورت میں سامنے آئے گا تو یقیناً مرغوبؔ صاحب کی شاعری کے وہ دیگر محاسن بھی سامنے آجائیں گے جن پر ابھی تک قارئین کی توجہ مرکوز نہیں ہوئی ہے۔

رنگ اور خوشبو کا ادیب

ـــــــــ ہرچرن چاولہ

ہرچرن چاولہ ۶ ردسمبر ۲۰۰۱ء کواوسلو (ناروے) کے ایک ہسپتال میں اِنتقال کر گئے۔ اُن کے چلے جانے سے ایک دور ختم ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک سلجھے ہوئے قلمکار ہی تھے بلکہ ایک شریف النفس اِنسان بھی تھے۔ چاولہ صاحب گذشتہ تیس برس سے ناروے میں مقیم تھے۔ اُنہوں نے ناروے کے بہترین افسانہ نگاروں کے شہ پاروں کو اُردو میں منتقل کر کے ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُردو، ہندی اور پنجابی زبانوں کی کئی تصانیف کا وہ نارویجن زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اِس طرح سے بِرصغیر ہندوپاک اور ناروے کے درمیان ایک ایسا ادبی پُل تعمیر کیا، جس کی اہمیت اور افادیت سے کوئی اِنکار نہیں کرسکتا۔

ہرچرن چاولہ ادبی دُنیا میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اُن کا نام اُس وقت توجہ کا مرکز بن گیا جب ۱۹۷۵ء میں ''عکس آئینے کے'' کے نام سے اُن کا افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بارے میں اُردو کے معروف کہانی کار جناب رام لال کو کہنا پڑا کہ اُن کے بعض افسانے اگرچہ اُن کے حساس مزاج کی پوری پوری نمائندگی کرتے ہیں لیکن اُنہیں نئے دور کے بہت سے افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں بعض خصوصیات کی بنا پر نمایاں بھی رکھتے ہیں۔ [1]

---

[1] ہرچرن چاولہ: عکس آئینے کے، ص ۵/۶

ہرچرن چاولہ میانوالی، مغربی پنجاب میں ۳ر نومبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں بھیرہ شاہ پور ضلع مغربی پنجاب (اَب پاکستان میں) سکول سے میٹرک، ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اِنٹر اور بی ٹی کالج نئی دہلی سے ۱۹۵۶ء میں گریجویشن کی۔ اِس طرح سے اُن کا بچپن داؤدخیل (ضلع میانوالی)، لڑکپن ملتان اور بھیرہ میں اور جوانی راولپنڈی اور میانوالی میں گزری۔ گریجویشن کے بعد چاولہ نے فلمی دُنیا کا رُخ کیا اور کئی برس تک بطورِ اَسسٹنٹ ڈائریکٹر فلموں میں کام کرتے رہے لیکن یہاں کی ظاہری چمک دمک سے اُن کا دل اُوب گیا۔ اس نمائشی دُنیا کے بارے میں اُنہیں اُردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی طرح بہت کچھ جاننے اور پرکھنے کا موقعہ ملا۔ حتیٰ کہ اُن کے کئی افسانے اس کی رُوداد پیش کرتے ہیں۔ قیامِ بمبئی کے دوران میں اُنہوں نے بہت کچھ لکھا اور وہ مشہور اِشتراکی شاعر ساحر لدھیانوی کے ساتھ رسالہ ''عبرت'' میں شائع ہونے لگے۔ لیکن بمبئی کی فضا اُن کو راس نہیں آئی۔ اُنہوں نے ریلوے میں ملازمت اختیار کر لی اور یہاں بطورِ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے اِکیس برس تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی دور میں اُن کی ملاقات مشہور افسانہ نگار رام لال سے ہوئی جن کی تخلیقات نے اُنہیں پہلے ہی کافی متاثر کیا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

> ''رام لال سے میری پرانی دوستی ہے۔ جو اَدب، ریلوے اور وطن میانوالی کے سنگم پر شروع ہوئی۔''[1]

ہرچرن چاولہ کے دِل میں ایک قسم کا لاابالی پن تھا۔ اِس لئے وہ ملازمت کی ذہنی غلامی برداشت نہ کر سکے۔ اُنہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ملازمت کو خیرباد کہا اور وہ مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے ۱۹۷۵ء میں اوسلو (ناروے) پہنچ گئے۔[2] یہاں ڈائنگ مانسکے لائبریری (اوسلو) میں اُردو، ہندی اور پنجابی کتابوں پر صلاح کار کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگے۔ وہ کچھ عرصہ تک ناروے میں تارکین کے اخبار ''سینٹر'' کے ایڈیٹر (لٹریچر) بھی رہے۔ اوسلو سے نکلنے والا اُردو کا دوماہی رسالہ ''پہچان'' ایک لمبے عرصے تک اُن کی ہی ادارت میں شائع ہوتا رہا اور اِس طرح سے وہ دُنیا کے اس اِنتہائی شمالی خِطّہ کے یخ بستہ برفوں کے درمیان بھی اُردو کی شمع جلاتے رہے۔

۱۔ ماہنامہ ''بیسویں صدی'' دہلی، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱۳

۲۔ ہرچرن چاولہ: البم (افسانے زندگی کے)

۱۹۸۰ء میں چاولہ نے ''ساہتک وچار سبھا'' کے نام سے ناروے میں ایک ادبی تنظیم کی بنیاد ڈالی اور اس واحد ادبی تنظیم کی طرف سے اُنہوں نے ناروے کے ادیبوں اور شاعروں کو اُردو دُنیا سے متعارف کرنے میں سرگرم رول ادا کیا۔

ہر چرن چاولہ بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کتب سے شغف رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اپنا تخلیقی سفر افسانہ نگاری سے شروع کیا اور ۱۹۴۸ء میں اپنا سب سے پہلا افسانہ لکھا جو سردار دیوان سنگھ مفتون کی ادارت میں دہلی سے نکلنے والے اخبار ''ریاست'' میں شائع ہوا۔ اُردو دُنیا نے اس افسانے کی کافی سراہنا کی اور اس طرح سے چاولہ کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اپنے ابتدائی افسانوں کے بارے میں میرے ایک اِستفسار کے جواب میں خود رقمطراز ہیں:-

> ''اِبتدائی افسانوں کے نام یاد نہیں............ بہت
> کچھ لکھا مگر بے گھری کے حالات میں سنبھال کر نہ رکھ سکا۔ ۱۹۵۷ء
> کے لگ بھگ مناسب طور پر SET ہوا اور ریلوے کوارٹر ملنے لگا تو کچھ
> ریکارڈ جمع ہونے لگا۔''[1]

ہر چرن چاولہ ایک حساس فنکار تھے۔ وہ ظلم و تشدّد برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی کہانیوں میں ایک عجیب درد کی کسک کا احساس ہوتا ہے۔ چاولہ نے ''عکس آئینے کے'' سے پہلے ہی اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اُن کا ناول ''درندے'' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول تقسیمِ ہند کے المیے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر یہ ایک سیدھی سادی کہانی ہے۔ دُکھ، درد، بھوک، اَفلاس، قتل و غارت کے ساتھ ساتھ یہ عشق و محبت کی تب و تاب کی داستان ہے۔ یہ کہانی درد کے رِشتوں کی کہانی ہے۔ چاولہ کا اَدبی سفر یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے اپنا مطالعہ اور مشاہدہ جاری رکھا۔ منٹو، کرشن چندر، بیدی اور قاسمی ایسے فنکاروں کی طرح اُن کے یہاں بھی رَدّ و قبول کا عمل ملتا ہے۔ چنانچہ منٹو کی بے باکی، کرشن کا اسلوب، بیدی کے مطالعے کی گہرائی، قاسمی کی تصویر کشی کے اَسرار و رموز کو اُنہوں نے پسند بھی کیا اور ان تمام چیزوں کو کسی نہ کسی طرح قبول کر کے راہ اور روشنی بھی پائی۔ جس کا وہ خود بھی جگہ جگہ اعتراف کرتے تھے۔

---

[1] راقم الحروف کے نام چرن چاولہ کا ایک خط

ہر چرن چاولہ نے ناول کے ساتھ ساتھ افسانے کو بھی اپنے اِظہار کا ذریعہ بنایا۔ حالانکہ وہ شعری ذوق بھی رکھتے تھے اور کلاسیکی اور جدید دونوں طرح کے شعرا کے کلام کا مطالعہ بھی کرتے تھے لیکن کہانی سے اُنہیں پہلا عشق تھا۔ اُن کے خیال میں جس طرح برف کا پانی پہاڑوں سے اُتر کر خود بہ خود اپنا راستہ تلاش کر کے دریا کی جانب بڑھتا ہے۔ اُسی طرح ایک ادیب کی دِلی کیفیات اور جذبات خود بہ خود اپنی راہ تلاش کرتے ہیں۔ ہر چرن چاولہ کو اِظہار کا فارم ملا۔ اُن کے پورے فن پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے فارم میں مصنوعی پن نہیں ہے بلکہ موضوع کے اعتبار سے جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ بڑے سلیقے سے کہتے ہیں۔

ہر چرن چاولہ کے افسانوں میں درد و کرب کا ایک عجیب احساس ہوتا ہے۔ یہ درد نہ صرف اُن کے موضوع میں ڈھل گیا ہے بلکہ اس کے لئے جو اسلوب برتا گیا ہے اس میں بھی یہ درد رِستا ہوا ملتا ہے۔ چاولہ کے بعض اُفسانوں میں اصلاحی میلان اور دیہی زندگی کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔ ایسے افسانوں میں ''لہریں اور کنارے''، ''ٹوٹا ہوا اُفق''، ''عکس آئینے کے''، ''پانی کی عورت''، ''ریت سمندر اور جھاگ'' کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ''عکس آئینے کے'' اُن کی نمائندہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کہانیاں دَراصل اُن کی اپنی نجی زندگی کا ایک رُخ پیش کرتی ہیں۔ ''عکس آئینے کے'' میں اُنہوں نے اپنی والدہ محترمہ کے تئیں محبت اور عقیدت کے جذبے کا اِظہار کیا ہے اور اُن کی زندگی کے ایک رُخ کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ چاولہ کے اور بھی کئی افسانوں میں اُن کی والدہ کا کردار نظر آتا ہے۔ جن میں اُن کی روایتی ممتا بھی ہے اور وہ گہری وابستگی بھی جو اُن کی والدہ کو اُن کے ساتھ رہی ہے۔ وہ اُن کی غم گسار بھی تھیں اور ساتھی بھی۔ چاولہ ایک زمانے سے غیر ممالک کی خاک چھانتے رہے لیکن پھر بھی وہ اپنے وطنِ عزیز ہندوستان کی مٹی کی خوشبو اپنے اُنگ اُنگ میں محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریروں میں ہندوستان کی مٹی کی بُو باس محسوس کی جاتی ہے۔ اُن کے افسانوی مجموعوں ''عکس آئینے کے'' (۱۹۷۵ء) اور ''ریت سمندر اور جھاگ'' (۱۹۸۰ء) میں اس قبیل کی بے شمار مثالیں نظر آتی ہیں۔ ''دُوسرا بادشاہ''، ''عکس آئینے کے''، ''بیگم''، ''ریت سمندر اور جھاگ''، ''گھوڑے کا کرب''، ''گنگا کی واپسی'' وغیرہ اُن کے چند نمائندہ افسانے ہیں جن میں اُن کے درد و کسک کی اَن گنت ٹیسیں محسوس کی جاسکتی ہیں۔

''گھوڑے کا کرب'' ہر چرن چاولہ کا ایک علامتی افسانہ ہے۔ اِس میں وہ ایک گھوڑے کا حالِ زار

بیان کرتے ہیں اور اس کے تئیں اُس کے مالک کا ظلم بیان کرتے ہیں۔ کہانی کلائمکس سے شروع ہو کر انٹی کلائمکس پر اِختتام پذیر ہوتی ہے اور ایک غیر روایتی انداز سے سفر طے کرتی ہوئی منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔ مالک اور گھوڑے کے درمیان جو تصادم پایا جاتا ہے، وہ دراصل آج کل کے فرد کا کرب اور اُس کا ذہنی تناؤ ہے۔ کہانی انوکھے انداز سے شروع ہوتی ہے۔ گھوڑا پورے سماج اور معاشرے کا غم اپنی ذات میں سمیٹ کر اِس عہد کے آشوب کو بیان کرتا ہے۔ افسانے کا ایک اِقتباس ملاحظہ ہو:-

''اس مالک کو تو ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ بمپر تک سواریوں سے لاد دیتا ہے اور گالیاں بھی بے شمار میرے سر پر لادتا رہتا ہے۔ سواری نہ ملے تو غصہ مجھ غریب پر۔ بیوی سے جھگڑا ہو تو چھانٹا میری پیٹھ پر۔ ساتھی تانگے والوں سے تُو تُو میں میں ہو تو سزا وار میں۔ کوئی ڈھنگ ہے جینے کا بھلا۔ یہ نہیں کہ میری سنو اپنی کہو۔ بس ہر وقت گالی گلوچ' ہال دہائی۔ کوئی کہاں تک برداشت کرے۔ پھر وقت بھی یہاں کوئی نہیں، بندھا ہوا کام کا ابھی آنکھ بھی پوری طرح نہیں کھلتی کہ لگام مُنہ میں اور بمپر دونوں کمر پر۔ شہر سٹیشن، سٹیشن شہر رات گئے تک ایک چکر سا بندھا رہتا ہے پاؤں میں، پھر نہ اِتوار چُھٹی نہ تہوار چُھٹی۔''

''بیگم مغربی فضاؤں میں رَچی بسی ایک خوبصورت کہانی ہے۔ حقیقت میں یہ ایک سیدھی سادی عشقیہ داستان ہے لیکن روایتی اسلوب سے اِنحراف کر کے چاولہ نے اِس کہانی کو اپنے منفرد انداز سے رُوح پرور بنایا ہے۔ اس میں رمیش تیواڑی اور پروین جیسے کرداروں کو جس زاویہ نگاہ سے اُبھارا گیا ہے' وہ بھی قابلِ ستائش ہے۔ کہانی ڈرامائی انداز سے شروع ہوتی ہے اور پھر مکالموں کی ادائیگی، کرداروں کے عمل اور ردِ عمل سے اِس میں ایک انوکھا پن پیدا ہو گیا ہے۔

''جانے دو'' بھی چاولہ کی ایک نمائندہ کہانی ہے۔ لگتا ہے کہ یہ کہانی اُن کے ذاتی تجربات پر مشتمل ہے۔ اس میں وہ اپنی پرانی یادوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یادوں کا ایک طویل سلسلہ اُبھرآتا ہے۔ چاولہ نے آزاد تلازمہ خیال کی تکنیک میں یہ کہانی پیش کی ہے۔ بظاہر اس کہانی میں الگ الگ ٹکڑے نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی پوری کہانی میں ایک باطنی رِشتہ پایا جاتا ہے، جو تاثر کی وحدت پیدا کرتا

ہے۔ دوسہ‘ ریت، سمندر اور جھاگ‘ کھڑکی‘ گنگا کی واپسی‘ بادشاہ‘ عکس آئینے کے‘ احساس کی زنجیریں‘ وغیرہ بھی اِسی قبیل کی کہانیاں ہیں۔ ان میں بھی اِنسان کا کرب، موجودہ دور کی بے راہ روی، محرومی و مایوسی اور تنہائی و بے چارگی کی داستان پیش کی گئی ہے۔ مثلاً:-

''دھرتی نے اسے کبھی بھوکا نہیں رکھا تھا۔ اُلٹا تھوڑی سی خدمات کے عوض کئی گنا زیادہ دیا تھا مگر ماں باپ کی بے وقت موت کے بعد وہ بھی دُوسروں کی طرح بھیڑ چال کا شکار ہو کر فارن پہنچ گیا۔ فارن نے ایک بے رحم محبوبہ کی طرح اس کی ماں کا کلیجہ مانگا تھا اور اس نے ماں کا کلیجہ نکال کر اسے پیش بھی کر دیا تھا۔ مگر ماں پھر بھی قدم قدم پر اس کی خیر مناتی رہی تھی، اس کی ہر ٹھوکر پر بے چین ہوتی رہی تھی۔ اس نے زمین کا ایک بڑا ٹکڑا بیچ کر لندن کا ٹکٹ خریدا تھا اور لندن کی ظاہری چمک دمک میں بھول گیا کہ اس نے کیا کھو دیا ہے، مگر ماں اُسے نہیں بھولی تھی۔ اس نے ہمیشہ اس کی پہلوان نما شخصیت اور صحت مند جسم کو برقرار رکھا تھا اور اس کی رگوں میں پہنچایا ہوا اپنا گرم خون کبھی واپس نہیں مانگا تھا۔''

(پہلا آدمی)

''تنہائی سے گھبرا کر میں نے دہلی جانے کا پروگرام بنا ڈالا۔ سوچا یہ شہرِ خموشاں تو مجھے زندہ دَرگور کر دے گا۔ بیٹا‘ بہو‘ پوتا‘ پوتی مجھے پیار تو بہت دیتے ہیں مگر پھر بھی کہیں کوئی کمی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ وہ بھی کیا کریں، میں نے خود ہی تو اُن کے پاس رہنے کے بجائے اُن کے قریب الگ فلیٹ لے کر رہنا پسند کیا ہے۔ اُن کی اپنی مصروف زندگیاں ہیں۔ میں خود بھی تو آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ یورپ میں تو ہر کوئی بھاگ رہا ہے یا بھاگ دوڑ کے بعد تھکاوٹ دُور کرنے کے کو آرام کر رہا ہے۔ جو بھاگ رہا ہے‘ اُسے فرصت نہیں کہ دو پل

رُک کر بات ہی کرے اور جو آرام کر رہا ہے' وہ اپنے آرام میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتا کیونکہ اِسی چند گھنٹوں کے آرام نے اُسے پھر دوڑ دُھوپ کے کولہو میں جتنے کے قابل بنانا ہ۔''

(مرچ مسالہ)

ہرچرن چاولہ ایک ناول نگار بھی ہیں۔ اُن کے ناول پڑھ کر اس فن میں بھی اُن کی فنی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کے اَب تک تین ناول ''درندے'' (۱۹۶۸ء)، ''چراغ کے زخم'' (۱۹۸۰ء) اور ''بھٹکے ہوئے لوگ'' (۱۹۸۴ء) شائع ہو چکے ہیں۔ ''درندے'' اُن کی اِبتدائی کوشش ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اُنہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز اسی ناول سے کیا تو بے جا نہیں ہوگا۔ اس ناول میں اگرچہ احساس کی شدت اور واقعاتی اور نظریاتی سطحوں پر توازن کی کمی نظر آتی ہے۔ لیکن پھر بھی کردار نگاری فضابندی اور جذبات نگاری مستحسن ہے۔ ''چراغ کے زخم'' چاولہ کا دُوسرا ناول ہے۔ یہ زیادہ منجھا ہوا اور بہتر ناول ہے جو ہندوستان اور ناروے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

''بھٹکے ہوئے لوگ'' ہرچرن چاولہ کا تازہ ترین ناول ہے۔ یہ جرمنی، ہالینڈ اور لندن کے خوبصورت پس منظر میں لکھی گئی ایک کہانی ہے۔ یہ دراصل دو بھگوڑوں سرن اور عاصم کی داستان ہے جو پیار و محبت کی کھوج میں یورپ کے ممالک میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور یہاں کے ماحول میں کھو جاتے ہیں۔ اُنہیں سکون اور راحت کی تلاش ہے' وہ دَر دَر کی خاک چھانتے ہیں۔ ''بھٹکے ہوئے لوگ'' چاولہ کے باقی ناولوں سے مختلف اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں زبان و بیان کے ساتھ ساتھ ندرتِ خیال اور فکر کی گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔

ہرچرن چاولہ کردار نگاری پر بھی امتیاز رکھتے تھے۔ اُن کے یہاں متحرک کردار نظر آتے ہیں جن میں حرکت اور حرارت پائی جاتی ہے۔ ان کرداروں کی اُٹھان فطری ہونے کے ساتھ ساتھ مؤثر اور پُرکشش ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاولہ بہت ہی بے چین آتما کے مالک تھے۔ وہ ذریعہ معاش کی خاطر کبھی فوج میں اور کبھی محکمہ ڈاک میں بھرتی ہوئے اور کبھی ریلوے کا رُخ کیا۔ ریلوے کی ملازمت کے دوران میں اُنہیں بڑے عجیب و غریب کرداروں کا مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا۔ یہی کردار اُن کی کہانیوں کے محرک بن گئے۔ چاولہ کی کہانیوں کے کردار ہندوستان میں رہنے بسنے والے لوگ بھی ہیں اور غیر ہندوستانی

بھی۔ تلاشِ معاش کے لئے دَر دَر بھٹکنے والے پڑھے لکھے نوجوان بھی اور شریف بھی اور جعلساز بھی، سماج کو لوٹنے والے کارندے بھی اور رشوت خور بھی۔ اس طرح سے کرداروں کا ایک طویل سلسلہ اُن کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔

چاولہ منظر کشی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ ایک مصوّر کی طرح پہاڑوں، جھیلوں، ندی نالوں، جھرنوں اور آبشاروں کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ اُن کا قلم کبھی بھی تھکنے کا نام نہیں لیتا۔ وہ خیالات کے بہاؤ کو خوبصورت طریقے سے رقم کرنے کے قائل تھے۔ علامتوں کا برتاؤ اُن کے یہاں مصنوعی نہیں بلکہ اپنے اندر سے اُگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ علامتیں بے شمار پیکروں کو جنم دیتی ہیں۔ جن سے نئے نئے خیالات اور مفاہیم اُبھر آتے ہیں۔ مظہر امام کو ہرچرن چاولہ کے بعض افسانے زمان ومکان کی حد بندیوں کو توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنے مضمون ''ہرچرن چاولہ کے افسانوی کردار'' میں ایک جگہ اپنے خیالات کی وضاحت یوں کرتے ہیں:-

> ''ہرچرن چاولہ اپنے بعض افسانوں میں
> زمان ومکان اور ہیئت کی حد بندیوں کو توڑتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس
> اِنحراف کے لئے بڑے توازن اور فن پر گرفت کی ضرورت ہے۔ مجھے
> کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ اُن کی کہانی انشائیہ یا کسی اور طرح کی تحریر کا
> رُوپ دھار لیتی ہے۔'' [1]

ہرچرن چاولہ کو زبان و بیان پر دَسترس تھی۔ چونکہ وہ اُردو کے علاوہ ہندی، انگریزی اور پنجابی زبانوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اِس لئے وہ اُن تمام زبانوں کے الفاظ استعمال کر کے اپنے فن کو اور بھی جاندار اور رُوح پرور بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کی کہانیوں میں خوبصورت تشبیہات واستعارات پائے جاتے ہیں جو اُن کی خداداد صلاحیت پر دال ہیں۔ یہ خوبصورت تشبیہات اور استعارات ایک نئے ماحول اور فضا کو جنم دیتے ہیں، جو حقیقت کے قریب ہے۔

ہرچرن چاولہ نہ صرف ایک معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہی تھے بلکہ اُنہوں نے بہت پہلے

---

[1] ماہنامہ ''ایوانِ اُردو'' دہلی، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ۷

''تم کو دیکھیں'' کے نام سے ایک دِلچسپ سفر نامہ بھی لکھا۔ ''البم'' کے نام سے اُن کی یادوں پر مشتمل ایک خوبصورت کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ جس میں اُن کی زندگی کی تلخ ترش اور شیریں یادیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ چاولہ کے بہت سے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''عکس آئینے کے'' (۱۹۷۵ء)، ''آتے جاتے موسموں کا سچ'' (۱۹۸۹ء)، ''دل، دِماغ اور دُنیا'' (۱۹۹۲ء)، ''سچ جیسے سپنے'' (۱۹۹۲ء)، ''دریا اور کنارے'' (۱۹۹۵ء)، ''ڈھائی اکھر'' (۱۹۹۶ء)، ''گریباں جھوٹ بولتا ہے'' (۱۹۹۶ء) اور ''گھوڑے کا کرب'' (۲۰۰۱ء) وغیرہ شامل ہیں۔

ہر چرن چاولہ اپنے اَدبی کارناموں کے لئے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ اُن کے بے وقت اِنتقال سے علمی واَدبی دُنیا میں ایک نہ پُر ہونے والا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ بھگوان اُن کی آتما کو شانتی دے۔

اُردو داستان اور ہندوستانی داستانیں

کہانی سُننے اور کہانی کہنے کا شوق اِنسان روزِ ازل سے ہی اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ صدیوں پہلے جب ابھی تہذیب کی صبح نہیں ہوئی تھی اور اِنسانی زندگی میں ابھی کوئی نظم وضبط پیدا نہیں ہوا تھا اور وہ درختوں کی چھاؤں میں، غاروں کے اندھیرے میں زندگی بسر کرتا تھا اور جنگل کے گھاس پات اور جنگلی جانوروں کے گوشت سے اپنا پیٹ بھرتا تھا' تو اُسے آئے دِن طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جنگل کے سنسان سناٹوں میں جنگلی جانوروں کا پیچھا کرتے ہوئے اُسے بغیر کسی مؤثر ہتھیار کے قدرت کی بے پناہ قوتوں سے متصادم ہونا پڑتا تھا۔ جنگلی جانوروں کی خوف ناک آوازوں، بجلی کی دِل ہلا دینے والی کڑک، برستی ہوئی بارشوں میں بیابانوں کا سفر، کڑکتی دوپہروں میں پھولی ہوئی سانسیں' یہ سب اور اس طرح کے بے شمار حادثات اور منزلوں میں سے گزر کر اُسے ایک عجیب اذیت بخش مسرّت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ تھک ہار کر لوٹ کر رات کے اندھیروں میں کسی الاؤ کے گرد بیٹھ کر اُس کی سب سے بڑی دلچسپی یہی ہوتی تھی کہ وہ اپنے عجیب وغریب تجربات کو اپنے ہم نفسوں کے سامنے پیش کرے۔ اور یہیں سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے اور یہی داستان طرازی کا پہلا پتھر ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس نے اس فن میں ترقی حاصل کی۔ اُس کے شعور نے انگڑائی لی۔ اُس نے یہ دیکھا کہ اُس کی کہانی سے دوسرے لوگوں کو دلچسپی پیدا ہوئی ہے اور ''اس کے بعد کیا ہوا'' کی ایک جبلی خواہش نے سامعین کی دلچسپی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ تب ابتدائی دور کے اس اِنسان نے اپنی داستان میں رعنائی اور رنگ پیدا کرنے کے لئے اپنے تخیل سے کام لیا اور وہ کبھی کبھی فرضی دِلچسپ تحیّر

پیدا کرنے والی کہانیاں سُنانے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی داستان کا رنگ بدلنے لگا اور وہ حقیقت سے ہٹ کر تصور کی دُنیا بسانے لگا۔ اس کے ذہن میں قدرت کی بے پناہ طاقتوں کے نئے نام اُبھرنے لگے۔ کبھی وہ بھوتوں کی کہانیاں کہنے لگا، کبھی جنوں کی، کبھی وہ کوہ قاف کی بلندیوں پر چڑھ کر اپنے تخیل میں بسی ہوئی پریوں کے ذِکر سے اپنے انداز گفتار کو شاداب کرنے لگا۔

اِنسان نے تہذیب کی دہلیز پر قدم رکھا تو زندگی میں پیچیدگیاں نظر آنے لگیں۔ اب اُس نے اپنی داستانوں میں ان پیچیدگیوں کو ایک مختلف انداز میں پیش کرنا شروع کیا۔ کردار وہی تھے جو اُس کے تصوّر و تخیل میں بسے ہوئے تھے لیکن جو بات وہ کہنا چاہتا تھا وہ اسی دھرتی کی بات تھی اور یہاں کے لوگوں کی بات تھی۔ کبھی وہ معلمِ اخلاق بنتا اور اخلاقی درسیات کے لئے مذہب کا سہارا لیتا اور لوگوں تک اخلاق اور پائیدار قدروں کی رعنائی پہنچانے کے لئے اساطیر اور دیو مالا کا سہارا لینے لگتا۔ اور پھر وہ دور آیا جسے عرفِ عام میں جاگیردارانہ دور کہا جاتا ہے۔ جب راجے اور مہاراجے، رئیس اور امیر اور وزیر ہوا کرتے تھے۔ جن کے پاس اپنی بے بس رعایا پر حکومت کرنے کے بعد بھی وقت بچتا تھا اور تفریح کے لئے آجکل کے سے ذرائع میسّر نہیں تھے۔ داستان گو نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا اور داستان کو اپنا وسیلہِ روزگار بنایا۔ وہ درباروں میں جا کر داستان سُناتا اور صاحبِ ثروت اُسے مالا مال کرتے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو داستان کو تخلیق کرتا تھا ایک معمولی دماغ اور ذہن کا آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک بڑا صنعت گر، ایک بڑا معمار اور ذہنِ رسا کا مالک تھا جو اپنے زورِ تخیل سے ایسی ایسی داستانیں تخلیق کرتا تھا کہ سُننے والوں یا پڑھنے والوں کی ساری دلچسپی اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

داستانوں میں ایک ایسا جہاں آباد ہوتا ہے جہاں چاروں طرف بلندی، کشادگی اور حیرت کی دیواریں کھڑی ہیں۔ داستان سُننے والوں یا پڑھنے والوں کے ذہنوں میں ایک عجیب کیف یا سرمستی پیدا کرتی ہے۔ رات کی تنہائیوں میں داستانیں پڑھیں جاتی تھیں اور سُننے والے اپنی آنکھوں میں داستانوں کے خواب سمیٹے ہوئے کھو جاتے تھے۔

داستان طرازی کا اوّلین منصب انجمن آرائی تھا۔ داستانوں کی بدولت محفلیں سجتی تھیں۔ نفسیاتی بیماروں کو شفا مِلتی تھی، غم نصیبوں کے غم ڈھل جاتے تھے۔ اس میں اکثر زیبِ داستان کے لئے فوق الفطری عناصر پیش کئے جاتے کہ جن کا مقصد تحیر پیدا کرنا تھا۔ یہ فوق الفطری عناصر داستانوں کی جان

ہے کہ ان کے باعث خیر اور شر کی قدروں کی ترجمانی ہوتی تھی اور یہ عنصر جہاں ایک طرف ایک خامی بھی ہے کیونکہ یہ اِنسان کی توجہ زندگی کے حقائق سے ہٹا دیتے ہیں لیکن دوسری طرف ان کی علامتی معنویت سے اِنکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ داستانوں میں مقفیٰ اور مسجع عبارت کا التزام کیا جاتا تھا کہ یہ اُس زمانے کی روش تھی اور یہ کہ نثر کی کرتب بازیاں اسی اسلوب کے ذریعے سے پیش کی جاتی تھیں۔ لیکن داستانوں کی ایک بڑی خامی یہ رہی ہے کہ اس میں ہمیشہ پلاٹ در پلاٹ ہوتے ہیں اور واقعات میں یکسانیت ہوتی ہے، جس سے طبیعت اُوب جاتی ہے۔ داستانوں کا ایک اور اہم عنصر ان کی طوالت ہے جس سے کئی تاثرات پیدا ہوتے ہیں اور اکثر اوقات تاثرات میں کوئی ہم آہنگی نہیں رہتی۔

داستان ہمارے اَدب کا زبردست سرمایہ ہے۔ اُردو ادب میں داستانوں کی کوئی کمی نہیں۔ بیشتر داستانیں ایسی ہیں جو فارسی اور عربی زبان کی مرہونِ منت ہیں۔ چنانچہ ماحول اور کردار بھی ہندوستانی سے زیادہ ایرانی لگتے ہیں۔ لیکن اُردو کے داستان طرازوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کردار یا یہ واقعات ہندوستانی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں ہندوستانی معاشرت، ہندوستانی کلچر کی رنگارنگی، ہمارے عادات واطوار صاف طور پر آئینہ نما ہو جاتے ہیں۔ داستانوں نے ہی ہمیں کہانی بُننے کا فن سکھایا ہے۔ اُردو فکشن کے لئے بُنیادی ڈھانچے کا کام کیا ہے اور یقیناً ہمارے ناولوں اور ہمارے افسانوں کی ساخت میں ہماری داستانوں کا بڑا حِصّہ ہے۔

اُردو داستانوں کی تاریخ ۱۹ویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہوتی ہے اور داستان نویسی کی پہلی عمدہ مثال عطا حسین تحسین کی ''نوطرزِ مرصع'' میں مِلتی ہے۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام بہت سی داستانیں لکھی گئیں۔ ان میں میر امن کی ''باغ و بہار''، حیدر بخش حیدری کی ''آرائشِ محفل'' اور ''طوطا کہانی''، خلیل علی خان کی ''داستانِ امیر حمزہ'' للو لال جی کی ''سنگھاسن بتیسی'' قابلِ ذکر داستانیں ہیں۔ یہ داستانیں فورٹ ولیم کالج میں جان گلکرائسٹ کی سرپرستی میں لکھی گئیں اور مقبول ہوئیں۔ ۱۹ویں صدی کی دُوسری داستانوں میں محمد بخش مہجور کی ''نورتن''، رجب علی بیگ سرور کا ''فسانہ عجائب''، نسیم چند کھتری کی ''گل صنوبر''، ''الف لیلیٰ''، ''طلسمِ ہوش ربا'' اور ''بوستانِ خیال'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ضخامت کے اعتبار سے ''الف لیلیٰ''، ''داستان امیر حمزہ''، ''طلسم ہوش ربا'' وغیرہ بڑی داستانیں ہیں۔

ان تمام داستانوں میں دلچسپی کا ایک ذریعہ ان کی طوالت میں پوشیدہ ہے۔ اس مقصد کے لئے داستان نگار اپنے تخیل کی مدد سے کئی ضمنی قصّے تخلیق کرتے رہے ہیں تا کہ اصل قصّے کے ساتھ ساتھ ضمنی قِصّوں سے پڑھنے والے کی توجہ برقرار رہے۔ یہ خصوصیت نہ صرف عہد قدیم کی داستانوں میں ملتی ہے بلکہ ''باغ و بہار'' اور ''فسانہ عجائب'' جیسی ادبی داستانوں میں بھی یہ عنصر موجود ہے۔ لیکن بعض داستانیں ایسی ہیں جو اس خصوصیت سے عاری ہیں۔ مثال کے طور پر اِنشااللہ خان اِنشاء کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' پیش کی جاسکتی ہے۔

داستانوں کے تفریحی اور اخلاقی پہلو بھی ہیں، قطع نظر اس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ان کے باعث اِنسان کی عملی زندگی میں ایک ربط وضبط پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ پڑھنے والوں کے لئے یہ بات یقیناً باعثِ کشش ہے کہ وہ اس میں نہ صرف خیر وشر، بدی اور نیکی، جھوٹ اور سچ کے مختلف دلچسپ قصّے پالیتا ہے بلکہ اُسے ایک گونا مسرّت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب داستانوں کے مختلف کردار کمزوریوں پر حاوی ہو کر شرافت، بہادری اور مردانگی کے جھنڈے گاڑ دیتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ داستان گوئی اپنے زمانے کا ایک زبردست اور پُر وقار فن رہا ہے اور اس نے اَدب میں ایک نمایاں رول ادا کیا ہے۔

بنسی نردوش ـــــــ
ایک سنجیدہ و متین شخصیت

بنسی نردوش بھی چلے گئے

کشمیری شعر و اَدب کے اُفق سے ایک اور ٹمٹماتا ہوا ستارہ بادلوں کی اوٹ میں آکر گُم ہو گیا۔ چاروں اور سناٹا سا محسوس ہو رہا ہے۔ خیالات میں ایک عجیب اُتھل پُتھل سی ہے۔ قُدرت کے فیصلے کو کون ٹال سکتا ہے؟ بنسی نردوش جو کل تک دُوسروں کے لئے کہانیاں لکھتے تھے آج خود ایک کہانی بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ ایک لمبے سفر پر روانہ ہوئے۔ ایک ایسے سفر پر جہاں سے کوئی بھی واپس نہیں آتا ہے بلکہ اپنے پیچھے یادیں چھوڑ دیتا ہے۔ نردوش جی بھی اپنے پیچھے یادوں کا ایک طویل سلسلہ چھوڑ گئے ہیں، اب اِنہی یادوں کے سہارے ہم اُنہیں دیکھ سکیں گے، اُنہیں محسوس کر سکیں گے۔

نردوش جی سے میری ملاقات بہت پرانی تھی۔ میں نے اُنہیں ہمیشہ غیور اور خوددار پایا۔ شروع شروع میں اُن کی سنجیدگی دیکھ کر میں اُن سے دور ہی رہا کرتا تھا لیکن جب مجھے پر یہ راز کُھل گیا کہ اُن کی سنجیدگی میں ایک خاص قسم کا والہانہ پن ہے تو میں اُن کے زیادہ قریب آتا گیا اور وہ بھی مجھ پر دستِ شفقت رکھنے لگے۔ اُس زمانے میں جب بھی میری کوئی تخلیق کسی اخبار یا جریدے میں شائع ہوتی تھی تو نردوش جی خوشی محسوس کرتے تھے۔ اُن کی حوصلہ افزائی سے ہی مجھ میں خوداعتمادی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ سوچتا ہوں کہ وہ دِن کہاں گئے؟ ماحول خوشگوار تھا، فرصت کے اوقات تھے، میری منزل یا تو کلچرل اکادمی ہوا کرتی تھی یا ریڈیو کشمیر سری نگر۔ اُسی دور میں ریڈیو کشمیر سرینگر سے تعلق رکھنے والے بے شمار فنکاروں اور

ادیبوں سے میری ملاقات ہوئی۔ کمال احمد صدیقی، قیصر قلندر، عبدالحق برق، بشیر بھٹ، سوم ناتھ سادھو، اوتار کرشن رہبر، پشکر بھان، موہن نراش، پران کشور، فاروق نازکی، مکھن لال بیکس، اور بنسی نردوش جیسے بزرگوں سے میرے اُسی زمانے میں قریبی روابطہ پیدا ہو گئے۔ یہ تمام بزرگ مجھ پر مشفقانہ نظر رکھتے تھے، مجھے گھنٹوں اُن کے ساتھ مختلف علمی وادبی مسائل پر گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ نردوش جی ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ اُن کی سادگی اور شرافت تھی۔ وہ اگرچہ باتیں کم کیا کرتے تھے لیکن جس مسئلے پر بھی گفتگو کرتے تھے اُس کو بجا طور پر اِختتام تک پہنچا دیتے تھے اور مختلف دلائل سے اِنسان کو قائل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ نردوش جی کا اصل میدان فکشن اور ڈراما تھا لیکن وہ ادب کے مختلف شعبوں پر بھی مدلل بحث کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑے ذہن اور خداداد صلاحیت کے مالک ہیں۔ اسی دور میں اُن کے بیسیوں افسانے مختلف اخبارات اور جراید میں شائع ہونے لگے۔ اُن کے درجنوں ڈرامے ریڈیو کشمیر سے براڈ کاسٹ ہوئے۔ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان کشمیری سے بھی گہری عقیدت رکھتے تھے۔ کشمیری زبان میں بھی اُنہوں نے بے شمار ادب تخلیق کیا۔ دان تھر، اجل تم وتہ پِدی، آکاش پاتال، بس اکھ طماہ، ناؤ واوتہ درپاؤ، پراگاش، قدہ گو جوأری محل خوانچ نوکرانی اور کانسہ مو راوٗین شورٗے پان وغیرہ نردوش جی کے بعض اہم ڈرامے ہیں، جو ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ تواریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ معروف فِلم ساز، ہدایت کار اور ادیب پران کشور، جو سالہا سال تک ریڈیو کشمیر سری نگر سے منسلک رہے اور بنسی نردوش کے ہم جلیس تھے، اپنے ایک مضمون میں نردوش کی ڈراما نگاری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

> ''بنسی نردوش بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں لیکن ریڈیو کے لئے اُنہوں نے بڑے اچھے اور قابل قدر ڈرامے لکھے۔ بس اکھ طماہ' اتنا مقبول ہو گیا کہ اُنہوں نے جلد ہی اس ڈرامے کو اسٹیج ڈرامے میں منتقل کیا اور پروڈکشن میں یہ ڈراما اپنا تاثر برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔''[۱]

(کشمیری سے ترجمہ)

---

۱ کاشر زبان تہ ادب (سون ادب-۱۹۷۶ء) ص ۲۹۴

نردوش جی کے تین افسانوی مجموعے بال مرائیو ، آدم چُھ پتے بدنام، اور گرداب بہت پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ ناول نگاری میں بھی وہ اپنی ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ "موکہ جار" اور "اکھ دور" اُن کے منفرد انداز کے ناول ہیں، جو کشمیری ناول نگاری کے شعبے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اُردو زبان وادب کے تئیں اُن کی خدمات کو کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۹۰ء کے اوائل میں جب لاکھوں کی تعداد میں کشمیری پنڈت' دہشت گردی کی وجہ سے نقل مکانی پر مجبور ہو گئے تو نردوش جی بھی اپنے کنبے کے ساتھ جموں چلے آئے اور بَن تالاب میں رہائش کرنے لگے۔ یہاں بھی اکثر اُن سے میری ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ اب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے لہذا فرصت کے اوقات میسّر تھے۔ اُن کے ساتھ مُجھے گھنٹوں اُٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔ تقریباً ہر اتوار کو اُن کے درِ دولت پر حاضر ہونا میرا معمول بن گیا تھا۔ چونکہ وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھتے تھے اِس لئے بڑے تپاک سے پیش آتے اور مجھے کھلاتے پلاتے' اور پھر مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ دراصل وہ محبت اور پیار کا پیکر تھے۔ میں اُن کی شخصیت اور فن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اِس سلسلے میں اُن سے متعدد بار فرمائش کرتا رہا کہ وہ مُجھے اپنے بارے میں مواد فراہم کریں لیکن وہ ہر بار ٹال مٹول کرتے رہے۔ دراصل وہ سستی شہرت کے قائل نہیں تھے اور نہ وہ اِن چیزوں کو کوئی اہمیت دیتے تھے۔ یہ میرا شوق اور تجسّس ہی تھا کہ میں نے کبھی اُن کا دامن نہیں چھوڑا بلکہ ایک دِن اپنے ٹیپ ریکارڈ میں اُن کی ایک طویل گفتگو ریکارڈ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اب جب کہ وہ اس دُنیا میں نہیں ہیں' یہ گفتگو میرے لئے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

بنسی نردوش کا اصلی نام بنسی لال ولی ہے۔ وہ ۱۹۳۰ء میں سری نگر کے محلہ بڑی یار میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پنڈت شیام لال ولی تیرتھ کاشمری اپنے زمانے کے مشہور ادیب تسلیم کئے جاتے تھے۔ وہ اُس دور کے بعض علمی و ادبی انجمنوں کے سرگرم رکن بھی تھے اور خود بھی انجمن سازی سے زبردست دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنے ہی دولت خانے پر ہفتہ وار ادبی میٹنگیں منعقد کروانا اُن کا معمول بن گیا تھا۔ چنانچہ اُس زمانے کی متعدد ادبی شخصیات ان میٹنگوں میں شامل ہوا کرتی تھیں۔ جن میں شاعرِ کشمیر مہجور، پریم ناتھ پردیسی، طالب کاشمیری، گنگا دھر بٹ دیہاتی، ویرو یشیشور، شام لال ایمہ، ماسٹر زندہ کول، دینا ناتھ زتشی، دینا ناتھ وار یکو شاہد کاشمیری، امر چند ولی، دینا ناتھ مست اور تیج بہادر بھان وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ یہ شخصیات اپنی اپنی تخلیقات پیش کرتی تھیں، جن پر بعد میں تنقید بھی ہوا کرتی

تھی۔ نردوش جی نے ایک اِستفسار کے جواب میں مجھے بتایا:-

''اس کے علاوہ وہ اُس زمانے میں ایک ادبی انجمن، انجمنِ اربابِ ذوق' کچھ ایسے ہی نام سے تھی تو اس کی بھی میٹنگیں ادیبوں اور شاعروں کے گھروں میں ہوا کرتی تھیں اور ایسی کئی میٹنگیں میرے پتاجی کے کمرے میں ہوئیں' جن میں اُس وقت کے نامور شعراؑ اور نامور لکھنے والے شامل ہوا کرتے تھے۔ مُجھے دو تین میٹنگوں کا پتہ ہے جن میں مہجور صاحب بھی شامل ہوئے تھے۔ ایک میٹنگ میں اُنہوں نے اپنی ایک مشہور نظم سنائی تھی جو بے حد پسند کی گئی۔''[۱]

بچپن سے ہی کہانیاں اور نظمیں سُن کر نردوش کے دِل میں ایک طوفان سا اُمڈ آیا۔ وہ بے چین رہنے لگے۔ آخر ایک دِن اُنہوں نے قلم اُٹھایا اور کہانی لکھنے بیٹھ گئے۔ اِس طرح سے اُن کی تخلیقی زندگی کا آغاز ہوا۔ کہانیوں کی طرف نردوش جی کی دِلچسپی میں اضافہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کی دادی جان اپنے دِل میں فوک اسٹوریز کا ایک بڑا خزانہ رکھتی تھیں[۲]۔ وہ رات گئے تک ننھے بنسی لال کو جنوں، پریوں اور بھوتوں کے ساتھ ساتھ پرانے بادشاہوں کے کارناموں کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ یہ کہانیاں سُن کر نردوش جی کے دِل میں اِنقلاب سا پیدا ہو گیا اور وہ بھی کہانیاں لکھنے کی طرف راغب ہوئے۔ چنانچہ جب وہ دسویں جماعت میں آ گئے تو اُنہوں نے اپنی پہلی کہانی ''مادھورام کی واپسی'' لکھی جو پنڈت پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار ''ہمدرد'' کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد وہ بے تحاشہ لکھتے رہے اور مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

بنسی نردوش کی ملازمت کا خاصہ حِصّہ صحافت سے وابستہ ہے۔ اپنے اس ذوق کی تسکین کے لئے اُنہیں ۱۹۴۸ء میں سری نگر سے امرتسر پیدل سفر کرنا پڑا۔[۳] اس سفر کو طے کرنے کیلئے اُنہیں بے شمار دشواریاں پیش آئیں لیکن اس مردِ مجاہد نے اپنی صحت کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے یہ سفر کئی دِنوں میں طے

۱۔ بنسی نردوش کے ساتھ ایک شام

۲۔ ایضاً

۳۔ بنسی نردوش کے ساتھ ایک یادگار ملاقات

کیا۔ امرتسر پہنچ کر اُنہیں ''شیر بھارت'' کے نام کے ایک روزنامے میں بطور کالم نگار ملازمت مل گئی۔ اس اخبار کے چیف ایڈیٹر ایک ایسے سیاست دان تھے جو بعد میں ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں میں شامل ہو گئے اور ایک مدت تک لوک سبھا کے سپیکر رہے۔ نردوش جی کافی عرصہ تک اس اخبار سے منسلک رہے۔ وہ اپنے روزمرہ کے کام سے فارغ ہو کر کہانیاں بھی تخلیق کرتے رہے۔ جو اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں مسلسل شائع ہوتی رہیں اور اُن کی کہانیاں خاص و عام میں مقبول ہونے لگیں۔ نردوش جی نے کہانیاں لکھنے کے ساتھ ساتھ اپنا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ اُنہوں نے پریم چند، سدرشن، کرشن چندر، منٹو اور بیدی کے ساتھ ساتھ گورکی، ترگنیف، پشکن، دوستووسکی اور طالسطائی کے ادب پاروں کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ اِس طرح سے اُنہیں کہانی کی تکنیک اور اس کے فن پر پوری پوری گرفت حاصل ہونے لگی اور وہ اپنی کہانیوں میں نئے نئے رنگ بھرنے لگے۔ ''شیر بھارت'' کے بعد وہ روزنامہ ''نیا زمانہ'' جالندھر کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہو گئے اور یہاں بھی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنا کام نبھاتے رہے۔ اب وہ صحافت کے میدان میں کافی مہارت حاصل کر چکے تھے اور اخبار کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا گُر بھی جاننے لگے تھے۔ اُنہی دِنوں اُن کی ملاقات معروف طنز نگار فکر تونسوی سے ہوئی۔ اُن کی صحبت میں رہ کر نردوش جی کو ادب اور صحافت کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقعہ مل گیا۔

بنسی نردوش کو اپنے مادرِ وطن کشمیر سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اُن کے دِل میں نچلے طبقے کے لوگوں کے لئے درد تھا' اُنہیں یہاں کے محنت کش عوام سے دِلچسپی تھی۔ اُنھیں کشمیر کی عطر بیز ہواؤں، یہاں کے پھولوں، یہاں کے سرسبز اور شاداب کھیتوں اور یہاں کے سربفلک پہاڑوں سے عشق تھا۔ اپنے مادرِ وطن کے اسی درد اور تڑپ نے اُنہیں کشمیر واپس آنے پر مجبور کیا۔ یہاں وہ غلام محمد میر راجپوری کے اخبار ''جہانِ نو'' میں شامل ہو گئے۔ وہ ایک مدت تک روزنامہ ''خدمت'' سری نگر کی ادارت بھی کرتے رہے۔ بنسی نردوش ریاستی محکمہ اطلاعات میں بھی فرائض انجام دیتے رہے اور قلیل مدت تک ماہنامہ ''تعمیر'' کی ادارت بھی کرتے رہے۔ جموں و کشمیر کے معروف صحافی صوفی غلام محی الدینؒ بنسی نردوش کو ایک تجربہ کار صحافی قرار دیتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

''بنسی نردوش کشمیر کی صحافت کے ایک نمایاں کردار

ہیں۔ اُن کی تحریروں کے احسان مند بہت سارے اخبار ہیں۔ اُنہوں نے مختلف اوقات پر کئی اخباروں کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ نردوش صاحب جہاں گئے صحافت اُن کے ساتھ رہی۔ اُنہوں نے جو بھی کام کیا صحافت اُن سے نہیں چھوٹی۔ وہ 'خدمت' کے علاوہ 'نیا سنسار' اور کئی دُوسرے اخباروں میں کام کر چکے ہیں۔ بنسی نردوش ایک تجربہ کار صحافی اچھے مقالہ نویس اور افسانہ نگار بھی ہیں۔''[1]

بنسی نردوش ایک عرصے تک صحافتی خدمات انجام دینے کے بعد ریڈیو کشمیر سری نگر کے اسٹاف سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ابھی چند سال قبل ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

بنسی نردوش مختلف ادبی و ثقافتی انجمنوں کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ سے بھی وابستہ رہے اور اپنی ملازمت کے دوران ریڈیو کشمیر سرینگر کے ملازمین یونین کے صدر بھی رہے۔

بنسی نردوش یوں تو کشمیر کے سربرآوردہ کہانی کاروں اور ڈراما نگاروں میں شمار ہوتے ہیں لیکن اُردو زبان وادب میں اُن کی خدمات کو کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں اُن کی درجنوں کہانیاں ہیں جو رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ ریڈ لیمپ اور اِنسان، رات کا مہمان، سناٹا، تارسوت، خواہش، پنجرہ، پچھتاوا' وغیرہ اُن کی نمائندہ کہانیاں ہیں' جن میں کشمیر کے محنت کش عوام کی مفلسی اور بدحالی کی پوری پوری عکاسی کی گئی ہے۔ نردوش ترقی پسند ادبی تحریک کے معماروں میں سے تھے۔ اُن کے معاصرین میں سے دیپک کول، علی محمد لون، غلام رسول سنتوش، اُمیش کول، تیج بہادر بھان اور اختر محی الدین کے نام لئے جا سکتے ہیں، جنہوں نے اپنی اپنی کہانیوں سے ایک زمانے میں دھوم مچائی تھی۔ لیکن نردوش جی کی کہانی ''تارسوت'' اُس زمانے میں بھی نمائندہ کہانی قرار دی گئی جس میں نہ صرف البیلے پن کا احساس ہوتا ہے بلکہ اِنسانی زِندگی کے گوناگوں تجربات بھی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں اُس دور کو یاد کرتے ہوئے نردوش کے افسانے 'تارسوت' کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

''اُمیش کی یاقوت' اور دائرے اور مرکز' بنسی نردوش

---

[1] صوفی غلام محی الدین: مرتب ''جموں و کشمیر میں اُردو صحافت''، ص ۱۹۵

کی تار سوت' لون کا پاپی پجاری، بت شکن اور سکھ کا ساحل' سنتوش کی خزاں کی خوشبو اُس دور کی کہانیاں ہیں جو توجہ کا مرکز ہیں۔ مگر' تار سوت' اس دور کی نمائندہ کہانی تھی۔"[۱]

بنسی نردوش نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں۔ اُن مضامین سے اُن کی تنقیدی سوجھ بوجھ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ "صبحِ صادق" کے نام سے اُن کا ایک کتابچہ بھی بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ نردوش جی کا بیشتر ادبی سرمایہ ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا اُن کی تمام تر تخلیقات جب شائع ہو جائیں گی تب اُن کے علمی و ادبی مقام اور مرتبے کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

افسوس کہ اُردو اور کشمیری زبان و اَدب کے اس بے لوث خدمت گذار کی شمعِ زندگی ۲۱ راگست ۲۰۰۰ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بُجھ گئی۔ اس طرح سے کشمیری اَدب کا ایک زریں دور ختم ہو گیا۔ بھگوان اُن کی آتما کو شانتی عطا کرے۔

---

[۱] ڈاکٹر برج پریمی: "جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما" ص ۳۵

سائِل کاشمیری کی شاعری

سائِل کاشمیری کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ہمارے اُن شعراُ میں شمار ہوتے ہیں، جنہوں نے عام اِنسان کی بول چال میں اپنی شاعری کا جادو جگایا ہے۔ سائِل کی شاعری سیدھی سادی شاعری ہے، جس میں عوام کا دُکھ درد، اُن کی ہنسی خوشی، اُن کی سماجی اور اِقتصادی زندگی کے نقوش جابجا نظر آتے ہیں۔ وہ ایک لمبے عرصے سے نظم ونثر کے میڈیم سے کشمیری زبان وادب کی خدمت کرتے رہے اور اپنی تخلیقات سے عوام کا لہو گرماتے رہے۔

سائِل کاشمیری نے مختلف اَصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی۔ وہ اپنی غزلیہ شاعری سے بھی اپنا درد انڈیلتے رہے اور نظموں میں بھی اپنے خیالات سے رنگ آمیزی کرتے رہے۔ بچوں کے لئے اُنہوں نے جو شاعری کی، وہ بھی قابلِ مطالعہ ہے اور اُن کی بھگتی شاعری بھی داد کے لائق ہے۔ سائِل نے بعض اچھے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ وہ کتابت کے فن میں بھی ماہر ہیں اور اسٹیج کرافٹ سے بھی کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں۔ کشمیری رسم الخط میں بہتری لانے اور اِس کو عام کرنے میں سائِل کی مساعی کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اِس طرح سے وہ نظم ونثر دونوں شعبوں میں قلم آزما چکے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ ایک شاعر کے طور پر ہی خاص وعام میں مقبول ہیں۔

پرتھوی ناتھ کول سائِل کاشمیری محلّہ شالا کدل (حبہ کدل) سری نگر کشمیر میں ۲رفروری ۱۹۳۸ء کو ایک

متوسط کشمیری پنڈت گھرانے میں پنڈت تاراچند کول کے ہاں پیدا ہوئے، جو خود بھی فارسی اور اُردو کے عالم تھے اور محکمہ مال میں ملازم تھے۔ اُنہوں نے اِبتدائی تعلیم اپنے ننھیال نور پورہ گیرو تحصیل پلوامہ ضلع اننت ناگ کشمیر میں پائی اور پھر ہندو ہائی اسکول سری نگر سے میٹرک کا اِمتحان پاس کیا۔ چھٹی جماعت سے ہی اُنہیں شاعری سے شغف ہوا اور یہ شوق آج تک دیوانگی کی حد تک قایم و دایم ہے۔ اسکول میں جدید کشمیری شاعری کے میرِ کارواں پنڈت دینا ناتھ نادمؔ کی حوصلہ اَفزائی سے سائلؔ کی شاعری پھلی پھولی اور پروان چڑھی، جو اُن دِنوں ہندو ہائی اسکول میں سائلؔ کے اُستاد رہے۔

اپنے اِظہار کے لئے خوشگوار ماحول پا کر سائلؔ نے اپنی شاعری کے اِبتدائی مراحل طے کئے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اور مسلسل ریاضت اور محنت سے اُن کی شاعری میں پختگی آنے لگی۔ چنانچہ جب وہ دسویں جماعت میں آگئے تو اُنہوں نے اپنی غزلوں کا مجموعہ "فریادِ سائلؔ" کے نام سے شائع کیا۔ میرے ایک اِستفسار کے جواب میں اُنہوں نے اپنی اِبتدائی زندگی کے بارے میں اِظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:-

> "......اسکول کے زمانے میں ہی یعنی چھٹی ساتویں جماعت سے ہی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ کشمیری زبان میں شعر کہنے لگا تو ایک اُستاد نے صبح اسکول کی مارننگ اسمبلی پر اپنا گیت سُنانے پر پوچھا کہ یہ گیت کہاں سے لایا تو مَیں نے جواب میں کہا کہ کچھ یاد آرہا ہے کہ اِسے میں نے ہی لکھا۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور کہا کہ آیندہ جو بھی یاد آئے گا، اُسے اپنی کاپی پر لکھ کر رکھنا۔ صحیح معنوں میں میرے یہی رہبر تھے اور وہ تھے میرے اُستاد جناب دینا ناتھ نادمؔ۔ اُنہوں نے مجھے اپنے اِظہار کے لئے خوشگوار ماحول فراہم کیا............"[1]

سائلؔ کاشمیری بچپن ہی سے شعر و اَدب کے دِلدادہ تھے۔ اسکول میں مکھن لال بیکس، جواہر لال کول، ڈاکٹر شنکر رینہ، ڈاکٹر پیارے لعل اوگرا جیسے ادیب اور اَدب نواز اُن کے ہم جماعتی رہے ہیں۔ نادمؔ صاحب اُن تمام لوگوں (جو اُس زمانے میں چھوٹے بچے تھے) کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ لہذا اُن

---

[1] راقم السطور کے نام سائلؔ کاشمیری کا ایک خط

کی ہمیشہ حوصلہ اُفزائی کرتے تھے۔ اُن تمام بچوں کو اُس زمانے میں نادؔم کے ''پنج پیارے''[۱] کے نام سے جانا جاتا تھا۔

اُسی زمانے میں سائلؔ صاحب کی ملاقات معروف شاعر اور محقق آنجہانی موتی لال ساقیؔ سے ہوئی۔ اُن کی صحبت میں رہ کر سائلؔ کی شاعری میں نکھار پیدا ہوگیا اور اُن کی شاعری کا سفر مختلف ابتدائی مدارج طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اُنہوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایس. پی. کالج میں داخلہ لیا، جہاں پروفیسر محی الدین حاجنیؔ، پرنسپل جیالال کول، پروفیسر سادھوؔ اور حامدیؔ کاشمیری جیسے اساتذہ اُن کی رہنمائی کرتے رہے۔ سائلؔ اِبتدا سے ہی ذہین تھے۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے وہ شروع سے ہی اساتذہ کی توجہ کا مرکز رہے۔ حتیٰ کہ اُن کی تخلیقات کالج میگزین ''پرتاپ''[۲] میں شائع ہونے لگیں۔ اِس کے بعد وہ مسلسل لکھتے رہے اور مقامی اخبارات میں چھپتے رہے۔

گریجویشن کے بعد سائلؔ ۱۹۶۱ء میں بحیثیت اُستاد تعینات ہوئے، لیکن پڑھنے لکھنے کی طرف اُن کی دِلچسپی کبھی کم نہیں ہوئی۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے چند محکمانہ اِمتحانات بھی کامیاب کئے۔ سائلؔ صاحب چونکہ تمدنی سرگرمیوں سے شروع سے ہی شغف رکھتے تھے۔ اِس لئے اُنہوں نے دو سال کی پینٹنگ اور ڈیکوریشن کی تربیت بھی حاصل کی۔ کشمیر کے معروف فنکار شری کاشی ناتھ بھان کی حوصلہ افزائی سے بہت ہی قلیل مُدّت میں سائلؔ کو اسٹیج، ایکٹنگ اور اسٹیج ڈیکوریشن کی تکنیک سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کے شعبہ سوشل ایجوکیشن میں ادارۂ تحریر و اشاعت کا وِنگ قایم کرنے کے لئے سائلؔ صاحب کی خدمات طلب کی گئیں۔ اُس ادارے کے زیرِ اہتمام اُنہوں نے نادؔم صاحب کی سرپرستی میں اپنے بعض دُوسرے ساتھیوں کے ساتھ ہفت روزہ اخبار ''گاش'' جاری کیا۔ شش ماہی جرنل ''تعلیم و تربیت'' اور سہ ماہی ''اِبتدائی تعلیم'' بھی اُسی اِدارے کی طرف سے سائلؔ صاحب کی نگرانی میں شائع ہوتے رہے۔ وہ سال ہا سال تک ریاستی محکمہ تعلیم کے ذمہ وار اَفسران کو کشمیری زبان کے رسم الخط کی تربیت دیتے رہے۔ چنانچہ اُس وقت کے وزیرِ اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق (مرحوم) نے اُن کے کام کو کافی سراہا اور بعد میں ۲۶ رجنوری ۱۹۷۲ء میں بسٹ ٹیچر ایوارڈ

---

۱ سائلؔ کاشمیری کے ساتھ ایک گفتگو

۲ راقم السطور کے نام سائلؔ کاشمیری کا ایک خط

سے نوازا۔ سائل صاحب اسٹیٹ اِنسٹی ٹیوٹ کے ادارۂ تحریر میں ایجوکیشن کمشنر کے اشاعتی شعبہ میں بطور لِٹریری ایڈیٹر بھی خدمات اَنجام دیتے رہے۔ یہاں بھی وہ افسرانِ اعلیٰ کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ سائل این.بی.آر.ٹی (دہلی) سے بھی کئی سال تک منسلک رہے۔ اُنہوں نے ایک مُدّت تک راشٹریہ بھاشا پرچار سمتی کے لئے بھی قابلِ قدر کام کیا۔ سائل ریاستی محکمہ تعلیم میں سال ہا سال تک خدمات انجام دینے کے بعد ابھی چند سال قبل ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور تب سے اَب تک پڑھنے لکھنے کے کام میں منہمک ہیں۔

سائل کاشمیری، کشمیری شعراُ کے اُس کارواں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو نادم، کامل، راہی اور مجبور کے بعد اُبھرا۔ اُن کے معاصرین میں موتی لال ساقی، رشید نازکی، چمن لال چمن اور مکھن لال بیکس کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ انہی شعراُ کے ساتھ سائل کی شاعری پنپ اُٹھی لیکن وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ اُن کے خیالات میں نمایاں تبدیلی آنے لگی۔ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے۔ اُن کے مطابق یہ الگ بات ہے کہ اُس تحریک سے متاثر ہونے والے بعض ادیب اور شاعر عملی طور پر اس تحریک کو آگے بڑھانے میں ناکام رہے۔ اِس لئے اُنہوں نے اس تحریک کے نمایاں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اپنا اُلو سیدھا کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ سائل روایت پسند ہیں لیکن اُنہیں نئے تقاضوں کا بھی احترام ہے، وہ روایت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ کشمیری ادبی تاریخ کے مصنفین سائل کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

> ''.....سائل نے کشمیری شاعری کی روایت کا دامن نہیں چھوڑا اور روایت کی حدود میں رہ کر وہ اپنے فن کو نکھار بخشتے رہے........''[1]

سائل کاشمیری غزل، نظم، گیت یعنی تمام اَصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اگر چہ غزل جیسی نازک صنفِ سخن سے اُنہوں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا لیکن ''لیلا'' یعنی بھکتی گیتوں اور نظموں سے وہ فطری مناسبت رکھتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا گھر شروع سے ہی مذہبی رسومات کا پاسدار رہا ہے،

---

[1] ناجی منور۔ شفیع شوق (مرتبین) ''کأشرِ ادبک تواریخ'' ص ۲۱۴

جہاں پوجا پاٹ، بھجن اور کیرتن کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اِسی ماحول میں سائِل نے آنکھ کھولی اور پھر اُنہیں اپنا بچپن اپنے ماما شری مہشر ناتھ مہشر کی آغوش میں گذارنے کا موقعہ ملا' جو خود بھی اپنے زمانے میں بھکتی مارگ کے شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اِس طرح سے بچپن سے ہی سائِل بھکتی گیتوں اور بھجنوں کے رس سے سرشار ہوتے رہے اور آگے چل کر وہ غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ بھکتی گیتوں اور بھجنوں کو بھی تخلیق کرتے رہے۔ سائِل بھکتی شعرأ میں سے پرمانند، لیلی ایشوری، روپہ بھوانی، رژدیدہ، کرشن جُوْ راز دان کے واکھیوں اور بھکتی گیتوں سے بے حد متاثر ہیں۔ وہ شری کرشن، رام چندر جی، سرسوتی ماتا، جگت کلیان کارینی ماتا بھونیشوری بھگوتی، پون پُتر ہنومان، جوالا ماتا، ماتا زیشٹھا، ماتا ساریکا اور بھگوان شیو کی اپنے گیتوں میں آرادھنا کرتے ہیں اور اُن کے قدموں کے نیچے ہر دَم سر جھکایا کرتے ہیں۔ وہ دُنیا کے ہر فرد کے لئے سچے دِل سے پرارتھنا کرتے ہیں اور ایک حقیقی بھگت کا رول نبھاتے ہیں۔ اپنے کتابچے "لولہ پوش" میں نہ صرف جگت کلیان کارینی ماتا بھونیشوری بھگوتی کے چرن کملوں میں عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں بلکہ تواریخی لحاظ سے بھگوتی بھونیشوری ماتا کے اَمرت کنڈ کے بارے میں بھی جانکاری فراہم کرتے ہیں، اپنے اِسی کتابچے کے آغاز میں رقمطراز ہیں:۔

> "........بزرگوں کے کہنے کے مطابق چندہ پورہ ہارون میں بھگوتی بھونیشوری ماتا کا چھوٹا سا اَمرت کنڈ راجہ ہریش چندر کے سمے یا اُس سے پہلے کا تصور کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس امرت کنڈ کے دونوں کونوں پر بھگوتی کی مورتیاں لگی ہوئی تھیں۔ اُس کنڈ کا ذِکر راج ترنگنی اور کلیاں وغیرہ گرنتھوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اِس لئے یہ ہزاروں سال پرانا اَمرت کنڈ ماتا کے چرنوں سے بہتا ہوا باہر آتا ہے.........."[۱]

سائِل کے بھکتی رَس میں ڈوبے ہوئے گیتوں میں بھی اُن کی نظموں کی طرح سادگی ٹپکتی ہے۔ الفاظ نرم و ملایم اور خیالات میں تسلسل ملتا ہے۔ اُن کی شاعری میں کہیں پر بھی ثقالت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ یہی سلاست اور سادگی اُن کے بھکتی گیتوں میں بھی نمایاں طور پر ملتی ہے، مثلاً:۔

---

۱ سائِل کاشمیری : "لولہ پوش" ص ۳

درشنہٕ چانٛژ چھم یژلادن   پمپوشہ پادن وندہے پرانٛن

مؤنہٕ پھلٕکۍ مائج تھوٕہے کرۍ کرۍ

ماج بھونی شوژی انوگر یہٕہ کر

ڈل ڈنڈۍ ڈنڈۍ بوٕیہٕ چانہٕ آسے   پرباتہٕ دراٛسے ہیتھ چون ناؤ

گُپہ کاۍ بیہٕ نشاطی ووٚتس یشہٕ برٕ

مائج بھوانی شوژی انوگر یہہ کر

(ترجمہ)   (تمہارے درشن کا متمنی ہوں

تاکہ تمہارے کمل جیسے پاؤں پر صدقے جاؤں

ماں تمہارے لئے پتلیوں کی مالا بنا کے رکھ دوں گا

ماتا بھوانی شریؔ مجھ پر کرپا کر

ڈل کے کنارے کنارے میں تمہارے درشن کے لئے آیا ہوں

پو پھٹتے ہی تمہارا نام لیا اور چلا آیا

گُپہ کار اور نشاط سے ہوتے ہوئے اِشہ بر پہنچ گیا

ماتا بھوانی شری مجھ پر کرپا کر)

اپنے بھجن ''جے ہنومان جی کی'' میں سائلؔ شری رام چندر جی کے سچے بھگت پون پتر ہنومان جی کی بہادری اور دِلیری کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اُن کے نزدیک جو بھی پون پتر کے دربار میں سچے دِل سے دروازہ کھٹکھٹائے گا، اُس کی من کی مُراد پوری ہو جاتی ہے۔ اِس بھجن میں سائلؔ راون کا قلع قمع کرنے اور لنکا کو بھسم کرنے کا منظر بڑے دِل نشین اَنداز میں پیش کرتے ہیں۔

''پمپوشہ مالئے'' سائلؔ کی بھگتی رَس میں ڈوبی ہوئی ایک اور سدابہار تخلیق ہے۔ اُس میں اُنہوں نے کرشن جی مہاراج کی شوخیوں اور شرارتوں کا بڑے موٴثر الفاظ میں اَحاطہ کیا ہے۔ راس لیلا کھیلنا، گوپیوں سے اَٹھکھیلیاں کرنا، جنگلوں اور بیابانوں میں گھومنا اور مُرلی کی تان سے ایک دُنیا کو دیوانہ بنانا

یہ تمام چیزیں سائلؔ کے اِس بھجن کا حاصل ہیں:-

بندرابن کے کرشن گوپالے
کامدیو ونہِ مرلی ژکن داران
گوپیہ چھیَے پراران کِھر کھنڈ تھالے
پمپوشہ مالے تراوے نالَے

ہے شیوشنکر، جے گنگا دھر، شیوشنکر ہے آو، جے شری رام جی کی، جے مائج شاریکا، جے ماتا جوالا وغیرہ بھی اِسی قسم کے گیت اور بھکتی رس میں ڈوبے ہوئے بھجن ہیں، جن میں سائلؔ نے اپنے قلم کا جوہر دِکھایا ہے۔ گُر و گیتا بھی سائل کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

سائلؔ کی نظمیں بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ یہ نظمیں مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں اور عام اِنسان کے ماحول کے گرد گھومتی ہیں۔ یہ نظمیں شادی بیاہ کی مختلف رُسومات سے متعلق بھی ہیں اور مختلف میلوں اور تیوہاروں کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ مختلف مذہبی تقاریب کی رنگارنگ تصویریں بھی پیش کرتی ہیں اور فطرت کے صد ہا رنگ کی بھی مصوّری کرتی ہیں۔ سائلؔ خود میلوں، تیوہاروں اور مختلف تقاریب میں حصّہ لینے میں زبردست دِلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن کی شخصیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ عوام کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا کرتے ہیں اور مختلف مذہبی اور غیر مذہبی تقاریب میں جا کر بھرپور مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اپنی نظموں میں اُس کی ہُو بہُو تصویر کھینچتے ہیں۔ اِس طرح سے اُنہوں نے اُردُو کے عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی کی روایت کو زندہ رکھا ہے۔ سائلؔ نے نظیر کی طرح ہولی، عید، محرم، بیساکھی جیسی عظیم تقاریب کا کُھل کر جائزہ لیا ہے اور اپنے خیالات کو مؤثر طریقے سے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ وہ اگرچہ روایتی اَنداز کے شاعر ہیں لیکن اُن کی نظموں میں جدیدیت کی پاسداری بھی جا بجا ملتی ہے۔ اِس ضمن میں اُن کی پاردٕ نٹھ نٹھ، ہو ہراے، مُودر خاب، شیُچ یُونی، راون تیول وغیرہ نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ نظم ''پاردٕ نٹھ نٹھ'' میں ایک پورا گھر طوفان کی لپیٹ میں آتا ہے اور دردناک منظر پیش کرتا ہے۔ ''راون تیول'' بھی سائلؔ کی ایک معنی خیز نظم ہے۔ اِس نظم میں شاعر ایک ایسی چیز تلاش کرتا ہے جس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ وہ پیہم جدوجہد کرنے لگتا ہے لیکن اُس کی تمام محنت رایگاں جاتی ہے۔

وہ اپنے آپ کو خود اپنے ہی حصار میں قید پاتا ہے۔ شکست و ریخت کا یہ سلسلہ نظم کے آخری دم تک قایم رہتا ہے۔ ہو ہرائے، مؤدر خاب، شیچ بونی، راون تیول، بھی ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں موجودہ دور کے اِنسان کا درد و کرب اُمڈ کے آیا ہے۔ مثلاً:-

پاردی نٹھ نٹھ دم پھٹرِ ہاوس
آشن گٹہ زول ویکہ گمژ ییژھ
رگٕہ دموٗ پھرٕ یمژ دگ شرر کنن لجٕ
اَچھ بے حرکتھ ژھرٹہ ژھرٹہ
چھوٗر چھوٗر

ہُتہ وُزملہٕ شی کرتھ دژ چیھ ترٹہٕ رُوخ پھیٖر یوکن خشمہ بورت
کس شانہٕ چھ پھوران لانز ژھرٹھ کس آمت آچھرٕ ستھرس کھر
چھنہ سہلابس رکنہ بتھ یاتھر
کس کیاہ بنہ کتھ ننہ؟
پھسرائے پھرائے، ہوہرائے ہوہرائے

سائل بچوں کے بھی اچھے شاعر ہیں۔ ''لوہتی ٹورء'' اُن کی بچوں کے لئے کہی گئی نظموں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے، جو ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ وہ خود اِس مجموعے کے آغاز میں لکھتے ہیں:-

''.........''لوہتی ٹورء'' حاضر خدمت ہے۔ یہ اِس کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ بچوں کے مزاج کے بن بن رنگ کے نغمے اِس میں درج ہیں۔ اِن نظموں میں سے چند نظمیں ایسی بھی ہیں جو ریڈیو کشمیر سری نگر سے نشر ہو چکی ہیں۔ بہت سے اسکولوں میں بھی بچے یہ نظمیں شوق سے پڑھتے اور گاتے ہیں.................''[1]

---

[1] سائل کاشمیری ''لوہتی ٹورء'' (دیباچہ)

''لوہ ہتہٕ ٹوٗرٕ'' میں سائلؔ کی قومی اور وطنی نظمیں بھی ملتی ہیں اور نیچرل نظمیں بھی، شخصیات پر نظمیں بھی اور عام موضوعات پر بھی۔ اِس مجموعہ کا ایک حصّہ منظوم کہانیوں پر مشتمل ہے۔ سائلؔ نے جہاں اقبالؔ، حفیظؔ اور اِسمٰعیل میرٹھیؔ کی بچوں کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے وہاں وہ عبدالاحد آزادؔ، نادمؔ اور فاضلؔ کی تخلیقی کاوشوں سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اُن تمام شعراُ کا رنگ بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔ اُن کی بچوں کی نظمیں ایک زمانے میں زبان زدِ عام تھیں، جس سے ان نظموں کی اِنفرادیت کا پتہ چلتا ہے۔ سائلؔ بچوں کی نفسیات سے واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی بچوں کے کھیل کود میں حصّہ لیتے رہے اور اُن کی نفسیات کا بغور جائزہ لیتے رہے۔ نچہ نچہ گاڈہ (چھوٹی چھوٹی مچھلیاں)، سون ملہ ژار (ہماری بھتیجی)، آزادی ہُند دوہ (یومِ آزادی)، سون عہد (ہمارا عہد)، میاَنہٕ کانگر (میری کانگڑی)، زُون (چاند)، گاٹہ جارپُھ بوڑ طاقت (ایکتا میں طاقت ہے)، بے عقل کاوٗ (بے وقوف کوا)، لالچی ہون (لالچی کُتا)، دوب، ہون تہٕ خر (دھوبی، کُتا اور گدھا) وغیرہ سائلؔ کی بچوں کے لئے کہی گئی چند نظمیں ہیں جن میں بچوں کی نفسیات، اُن کی تعلیم وتربیت اور اُن کے کھیل کود کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔ یہ نظمیں زبان وبیان، واقعات وخیال اور اِختصار کی وجہ سے انفرادیت رکھتی ہیں۔ بعض نظموں میں بچوں کے دِل کی دھڑکن محسوس کی جاسکتی ہے۔ ''لوہ ہتہٕ ٹوٗرٕ'' میں بعض ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو کشمیر کے کلچر، تہذیب اور تمدّن کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ اِس ضمن میں سونتھ، ہاپمپوشر، ہرد، بادام ژُور، ڈل سائل، آرہ، زونہ گاش، میاَنہٕ کانگر وغیرہ نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً:-

میاَنہٕ کانگر رنگدار کانگر میاَنہٕ اتھ چھے رنگہ رنگہ بیون بیون اکھا کانہٕ

رنگہ کانے ژاراہ پتھ اننا وٗم

رموٗ پیو رقوستی شوبہ ناوٗم

رموٗیہ ژالنہٕ دُل نا ششر دانہٕ میاَنہٕ کانگر رنگدار کانگر میاَنہٕ

رنگہ ناوہ وزٕ وے گٔرِ ھوے ڈل تے ڈل گیٖتہ نیرٕ وے گٔڈرے بل تے

وچھتوے رنگہ ڈونگن ہنٛد نظارہ لرناوُن چُھ وتھرتھ مخمل تے

نپہ نپہ کروٗن سون سون آباہ پمپوشو تلہٕ پرِ بزلان کھیل تے

سائل کاشمیری کی نظموں سے جو کشمیر کی اِمیج بنتی ہے، وہ مصنوعی نہیں ہے اور نہ اِس میں مبالغہ آمیزی ہے، بلکہ اِس میں حقیقت کا عُنصر جگہ جگہ غالب ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ سائل یہاں کی مٹی میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ اُنہوں نے یہاں کے سرد و گرم کو محسوس کیا ہے۔ وہ یہاں کے ذرّے ذرّے سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اِسی لئے اُن کی شاعری میں کشمیر کی دِل پذیر تصویر مختلف اور خالص مقامی علامتوں کے ذریعے سے سامنے آتی ہے۔ اُن کے یہاں کشمیری عوام کی غربت، اَفلاس اور ناداری کے دُھندلے دُھندلے نقوش بھی ملتے ہیں اور خوبصورت باغات، رنگ بدلتے ہوئے موسموں اور صاف وشفاف پانی سے بھرے ہوئے چشموں، آبشاروں، دریاؤں اور ندی نالوں کی عکاسی بھی اُنہوں نے مؤثر اَلفاظ میں کی ہے۔ اُن کے ہاں وہ ضرب الامثل بھی ملتی ہیں جن سے ہماری خمیر بنی ہوئی ہے۔ خالص کشمیری محاوروں، تراکیب اور علایم نے بھی سائل کی شاعری میں ایک خوشنما فضا قایم کی ہے۔

سائل نے غزلیں بھی کہیں ہیں۔ اُن غزلوں میں روایتی رنگ ملتا ہے۔ اُن میں نہ طوفانی لہروں سے ٹکرانے کا ذِکر ہے اور نہ ہی بجلی کی کڑک، بلکہ ان میں کشمیر کے خوبصورت پھولوں، دریاؤں، آبشاروں اور چشموں کا ذِکر ضرور ملتا ہے۔ سائل کہیں کہیں اپنی غزلوں میں عصری مسائل کو بھی پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن بعض غزلیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں نہ تو فکر کی گہرائی ہے اور نہ ہی جذبات کی ہم آہنگی۔ بعض جگہوں میں زورِ بیاں سے بات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اصل میں سائل کی شاعرانہ اُپج اُن کی نظموں اور بھکتی گیتوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ کشمیری زبان واَدب کے اس بے لوث خدمت گذار کو یکسر فراموش کیا گیا ہے۔ لیکن وقت آئے گا جب کشمیری زبان واَدب کی تاریخ نئے سرے سے ترتیب دینے والے اُن کی شخصیت اور فن کی بازیافت ضرور کریں گے اور اُن کی شاعری کی نئی جہتیں خود بہ خود اُجاگر ہو جائیں گی۔

مندروں کے شہر کا کہانی کار

ـــــــــ کشوری منچندہ

کشوری منچندہ ریاست جموں و کشمیر کے ایک قابلِ ذکر افسانہ نگار ہیں۔ اُنہوں نے اُس دور میں لکھنا شروع کیا جب ریاست کی ادبی فضا ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ اُن سے پہلے بعض ایسے افسانہ نگار سامنے آئے جنہوں نے اپنے اسلوب کی ندرت اور زبان و بیان کی تازہ کاری سے اُردو ادب کی اس صنف کو نئی سمت عطا کی۔ پریم ناتھ پردیسی میرِ کارواں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کے معاصرین میں رامانند ساگر اور کشمیری لال ذاکر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، حامدی کاشمیری، نور شاہ، برج پریمی اور پشکر ناتھ وغیرہ ریاست سے باہر بھی اپنے قلم کی جولانی سے افسانہ نگاری میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ کشوری منچندہ اگرچہ ۱۹۶۰ء کے بعد افسانہ نگاری کے اُفق پر نمودار ہوئے لیکن جلد ہی اپنی ایک الگ راہ متعین کرنے میں کامیاب ہوئے۔

کشوری منچندہ ۲؍مارچ ۱۹۲۹ء کو جموں کے محلہ پرتاپ گڑھ کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والدہ کی طبیعت اکثر ناساز رہا کرتی تھی، لہٰذا اُن کی پرورش اُن کی ۱۶ سالہ بہن کرنے لگیں۔ اس

طرح سے منچندہ کو بہن کا پیار تو ملا لیکن وہ ماں کی ممتا سے محروم ہونے لگے۔ جس کا احساس اُنہیں زندگی بھر تڑپاتا رہا۔ پڑھنے لکھنے سے منچندہ کو گہرا لگاؤ تھا۔ والد معمولی ملازم تھے لیکن پھر بھی اپنی قلیل آمدنی کے باوجود وہ اپنے بیٹے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے رہے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کرنے کے بعد ابھی میٹرک کا نتیجہ بھی نہ نکلا تھا کہ گھر والوں نے شادی کے بندھن میں گرفتار کیا۔ اس طرح سے اُنہیں زندگی کے حقائق کو بچپن سے ہی سمجھنے کا موقعہ ملا۔ والد کی قلیل آمدنی سے کتنی دیر اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پال سکتے تھے، اِس لئے تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ ۱۹۶۲ء میں محکمہ تعلیم میں مدرّس ہو گئے۔ ملازمت سے جب اُن کی مالی حالت تھوڑی بہت سُدھرنے لگی، اُنہوں نے پڑھنے لکھنے کا شوق پھر سے برقرار رکھا۔ چنانچہ ادیب فاضل کے ساتھ ساتھ بی۔اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔ اِس طرح سے اُن کے گریڈ میں بھی اضافہ ہو گیا اور زندگی کی گاڑی بھی آرام سے چلنے لگی۔ منچندہ نے بعض محکمانہ امتحانات بھی کامیاب کئے۔ اُنہوں نے ایم۔اے (اردو) کی ڈِگری جموں یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) اپنی کتاب میں اُن کا تعارف یوں کراتے ہیں:-

''کشوری لال منچندہ پرتاپ گڑھ جموں کے رہنے والے ہیں۔ اصلی نام کشوری لال ہے لیکن اشترا کی رجحان نے عجیب طرح پر ''لال'' کو ''لعل'' سے خلط ملط کر دیا۔ اب اُنہیں ''لعل'' کے ساتھ ''لال'' سے بھی بیر ہے، حالانکہ یہ اشترا کیت کی علامت تھی۔ اُن کی ولادت جموں کے متوسط خاندان کے ایک خوشحال گھرانے میں ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ تعلیم جموں میں ہی پائی اور ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد حالات نے اُن کی خاندانی حیثیت پر بُرا اثر ڈالا اور وہ سکول میں مدرسی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔''[1]

کشوری منچندہ پڑھنے لکھنے سے زبردست شغف رکھتے تھے۔ وہ شروع سے ہی گھر کے باقی افراد سے الگ تھلگ رہا کرتے تھے، البتہ بچپن میں بزرگوں سے جنوں اور پریوں کی کہانیاں بڑے شوق اور انہماک سے سُنا کرتے تھے۔ جب نویں جماعت میں آگئے تو اُن کا اُردو پرچہ دیکھ کر اسکول کے اُستاد نے اُن سے کہا کہ ''آپ میں ادیب بننے کی تمام تر صلاحتیں موجود ہیں''۔ اُستاد کے اسی فقرے نے اُنہیں مہمیز عطا کی۔ منچندہ نے اسی زمانے میں ''دیہاتی اور شہری زندگی کا مقابلہ'' کے نام سے ایک مضمون سکول

۱۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، حصہ سوم، ص ۱۸۰

کی ادبی نشست میں پڑھا، جو بہت پسند کیا گیا اور اس طرح سے اُنہیں کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ اپنا مطالعہ وسیع سے وسیع تر کرنے لگے۔ چنانچہ اُنہوں نے منٹو، کرشن چندر، بیدی اور احمد ندیم قاسمی کے فن پاروں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اس طرح سے اُنہیں افسانے کی تکنیک اور اس کے فن سے گہری واقفیت ہونے لگی۔ مطالعے کی گہرائی اور افسانے کے فن سے اُن کی دلچسپی اُن کی تحریروں میں آہستہ آہستہ سے ایک نئی جان ڈالنے لگی۔ وہ بے تکان لکھنے لگے اور مقامی اخبارات میں شائع ہونے لگے۔ بعد میں جب افسانے کے فن پر اُنہوں نے قابو پالیا تو وہ بڑے جاندار افسانے لکھنے لگے۔ اُن کا ایک افسانہ ''کِڈنی وارڈ'' ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی کے افسانوں کے ایک انعامی مقابلے میں دُوسرے نمبر پر آیا۔ اس مقابلے میں ملک بھر کے افسانہ نگار شامل ہوئے تھے لیکن منجندہ کا افسانہ انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس طرح سے اُنہیں اپنی صلاحیتوں کا احساس ہونے لگا اور اُن میں خوداعتمادی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

کشوری منجندہ ترقی پسند افسانہ نگار تھے۔ اُن کے معاصرین میں عمر مجید، دیریندر پٹواری، مالک رام آنند، امر مالموہی، کلدیپ رعنا اور شبنم قیوم کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے معاشرے کا درد وکرب پیش کر کے بے شمار افسانے لکھے۔ کشوری منجندہ بھی زمانے کے رواج کے مطابق لکھتے رہے اور اپنے تخیل کی تازہ کاری سے اپنے افسانوں میں نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اُن کے اب تک چھ افسانوی مجموعے'' اور بھی غم ہے زمانے میں محبت کے سوا'' (۱۹۶۷ء)، '' ہرے پودے بنجر زمین'' (۱۹۶۸ء)، '' سڑک انصاف کرتی ہے'' (۱۹۷۱ء)، '' احساس کے گھاؤ'' (۱۹۷۸ء)، ''شکستِ آرزو'' (۱۹۸۰ء) اور '' تکون کا کرب'' (۱۹۸۲ء) زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

کشوری منجندہ نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز رومانی قصوں سے کیا۔ اُنہوں نے بے شمار افسانے لکھے جن میں عشق ومحبت کی تب وتاب نظر آتی ہے لیکن جلد ہی وہ حقیقی دُنیا میں آگئے اور اپنے اندر کے درد کو کاغذ پر اُنڈیلنے لگے۔ اُنہوں نے کبھی بھی سماج اور معاشرے کا کرب پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ وہ ہر دم اپنے افسانوں میں بھوک، افلاس، سماجی نابرابری، طبقاتی نظام کی مرقع کاری کرتے رہے۔ اُن کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تمام منزلوں سے گذر چکے ہیں۔ اُنہوں نے سماج میں

ہوئی زیادتیوں کا بھی بغور جائزہ لیا ہے اور غربت، بھوک، افلاس کے مارے لوگوں کی سسکیاں بھی سُنی ہیں۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کو بھی در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھا ہے اور سماجی ٹھیکہ داروں کے ہاتھوں پھیلے ہوئے زہر کو بھی ہنستے ہنستے پیا ہے۔ اسی لئے اُن کے افسانے ان تمام حقائق کی تلخ تصویریں سامنے لاتے ہیں۔ ''تکون کا کرب''، ''شکستِ آرزو''، ''ہم ہندوستانی''، ''بیوقوف''، ''نیا سویرا''، ''سڑک انصاف کرتی ہے''، ''ڈاکٹر'' اور ''احساس کے گھاؤ'' اُن کے نمائندہ افسانے ہیں جن میں معاشرے کا کرب محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی منچندہ کے افسانوں کو عصرِ حاضر کے انسان کے افسانے قرار دیتے ہیں جو غموں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو کے بھی اپنی منزل کی جستجو میں سرگرمِ عمل ہیں۔ چنانچہ اپنی کتاب میں ایک جگہ اس کلیئے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> ''کشوری منچندہ ہمارے جانے پہچانے کہانی کار ہیں۔ وہ ایک عرصہ سے اپنی رُوح کا درد کہانیوں کے وسیلے سے بیان کرتے رہے ہیں۔ وہ صرف ذہنی ترنگ کے اظہار پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اِن پیچ در پیچ تجربات پر سے پردے سرکاتے ہیں جو دِل کے کواڑ پر دستک دیتے ہیں۔''[1]

کشوری منچندہ کے بعض افسانوں میں خود کلامی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ جذبہ شدت اختیار کرتا ہے اور کبھی سمندر کی موجوں کی طرح خاموش ہو جاتا ہے۔ کبھی بے جان اشیاء میں جان ڈالتا ہے اور کبھی دہکتے ہوئے انگاروں پر چل کر اپنے سوالات کے جواب طلب کرتا ہے۔ یہ سوالات بھوک، افلاس اور سماجی نابرابری کے ہیں جنھوں نے اُن کو عمر بھر تڑپایا ہے۔ منچندہ اپنے افسانوں میں خود بھی اپنا کردار نبھاتے ہیں۔ وہ کبھی مدرّس بن کر اپنی لاچاری اور مفلسی کا رونا روتے ہیں اور کبھی ایک پڑھا لکھا بے روزگار نوجوان بن کر ملازمت کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اُنھوں نے تلخیوں کا زہر گھول گھول کر پیا ہے۔ جھوٹ، فریب، ناانصافی اور ظلم سے اُنہیں ازلی نفرت ہے۔ اُنہیں تلاش ہے آبرو کی، ایمانداری کی، سچائی کی اور انصاف کی، جو اس دور میں ناپید ہے۔ اِسی لئے پروفیسر منظر اعظمی کو دُنیا کا سارا درد اُن کے دِل میں سمایا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک جگہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

---

[1] ڈاکٹر برج پریمی: جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما، ص ۲۰۴

''کشوری منچندہ نے دُنیا کم دیکھی ہے مگر دُنیا نے
اسے ہزاروں بار دیکھا ہے اور ہر بار اس کے قہقہوں نے دُنیا کا جگر
چھید ڈالا ہے، چھلنی کر دیا ہے۔ اس لئے کہ خود اس کا دِل زخمی ہے۔ اس
کی روح پیاسی ہے۔ اس کی تمنائیں مر چکی ہیں۔ مگر انسانیت کی محبت
نے اِس کی آنکھوں کی عبارت اور ذہن کی جودت نہیں چھینی ہے جس
سے وہ حقائق کو پہچانتا اور افسانوں کی تخلیق کرتا ہے۔''[۱]

کشوری منچندہ کے افسانوں میں بہت سارے کردار اُبھر کر سامنے آتے ہیں لیکن مدرس اور طلباً کے کرداروں کے ساتھ اُنہیں گہرا لگاؤ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود اسی پیشے سے متعلق رہے ہیں اور عمر بھر ایک سچے انسان کے فرائض انجام دیتے رہے۔ وہ نہ تو رشوت سے پیسہ کمانے کے چکر میں رہتے ہیں اور نہ کسی کا حق تلف کرنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ وہ ایک باوقار زندگی گذارنا چاہتے ہیں اور سچے محبِ وطن کے فرائض انجام دینے کے متمنی ہیں۔ اِس ضمن میں اُن کے افسانے ہم ہندوستانی' نیا سویرا، احساس کے گھاؤ، تکون کا کرب، فیصلہ، درد کا رشتہ اور پتھر کا آدمی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ہم ہندوستانی کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں جذبۂ انسانیت اور وطن پرستی کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے:۔

''ہندوستانی روایات کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ زخمی
دُشمن کی بھی جان بچانے کی کوشش کی جائے۔ یہ بچ جائیں گے بھیا!
اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے اور ان کو بچانے کا سہرا ڈاکٹر گوتم
کے سر ہے، جن کا خون اس وقت انہیں نئی زندگی دے رہا ہے۔ میں
ڈاکٹر گوتم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں، جنہوں نے ہندوستانی روایات،
کلچر اور تہذیب کی عظمت کو برقرار رکھا ہے اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ
ہم ہندوستانی اپنے دُشمن کو اپنا لہو بھی دے سکتے ہیں۔''[۲]

منچندہ کے افسانوں میں مختلف مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ کبھی پتنی ٹاپ کی سیر کراتے ہیں

۱۔ کشوری منچندہ: ہرے پودے بنجر زمین' ص۸
۲۔ کشوری منچندہ: احساس کے گھاؤ' ص۱۰

اور کبھی مانسر جھیل لے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف معمولی سے معمولی سفر کو الفاظ کے تانے بانے سے دِلچسپ بناتے ہیں بلکہ اپنے خیالات کی رنگ آمیزی سے اپنی تحریروں کو مؤثر اور جاندار بناتے ہیں۔ اُن کے افسانے ''کہرے کی وادی'' کا یہ منظر اُن کی منظر نگاری کا ایک جاذب نظر نمونہ ہے:۔

> ''پتنی ٹاپ کا وہ حسین دِلکش منظر آج بھی میرے ذہن کے پردے پہ نقش ہے جبکہ اگست کی ایک حسین شام کو وہاں کہرا پڑا ہوا تھا۔ وہ کہرا اتنا نظر نواز اور دِلکش تھا کہ نگاہ پڑتے ہی دِل کے نرم نرم گوشوں میں خوابیدہ جذبات بے اختیار جاگ اُٹھے تھے اور اُونچے اُونچے درختوں کی باہوں میں سویا ہوا وہ میدان اتنا حسین اور خوبصورت لگ رہا تھا کہ بے اختیار یہ جی چاہنے لگا تھا کہ ابھی اس پہ لوٹیں لگانا شروع کردیں۔''[1]

کشوری منچندہ کے بعض افسانوں میں وطن پرستی اور قوم پرستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اُن کے ہاں رُومانیت کا پہلو بھی اپنے پورے شدومد کے ساتھ اُبھرتا ہے۔ زبان عام فہم اور ثقالت سے پاک ہے۔ اپنی بات منوانے کے لئے وہ تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں اور اس طرح سے اپنے افسانوں میں شدت اور تازگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ روایت کا دامن بھی نہیں چھوڑتے ہیں اور نہ جدیدیت کی ڈگر پر چل کر قاری کو اُلجھا دیتے ہیں۔ بلکہ اُنہوں نے بیچ کا راستہ اختیار کر کے حقائق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیوی اور مکان، سڑک انصاف کرتی ہے، اور شہنائی بجتی رہی، نیا سویرا اور تکون کا کرب جیسے افسانے سماج میں پھیلے ہوئے ناسور کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اُن کا افسانہ ''بیوی اور مکان'' ایک دِلچسپ افسانہ ہے۔ اس میں وہ ایک چھوٹے سے مکان کا ذکر کرتے ہیں اور اُس تنگ و تاریک گلی کی تصویر کھینچتے ہیں جو صرف پچاس گز شمال کی جانب بازار میں کھلتی ہے جہاں ایک عاشق طبیعت حلوائی صبح سویرے دہی فروخت کرنے کے دوران خوبصورت عورتوں کو مردوں پر ترجیح دیتا ہے اور دِل ہی دِل میں اپنی بھڑاس نکالتا ہے۔

''احساس کی دھڑکن'' کو بھی میں منچندہ کے کامیاب افسانوں میں جگہ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

---

[1] کشوری منچندہ: کہرے کی وادی، ص ۵۶

اس میں پروفیسر ورما اپنی زندگی کے تجربات سے طلبا کو روشناس کراتے ہیں اور کم عمری میں شادی نہ رچانے کی تلقین کرتے ہیں لیکن افسانے کا دُوسرا کردار سُریش زیادہ بچے پیدا کرنے کی وکالت کرتا ہے۔ جب کہ سُریش کی ہم جماعتی سوشیل کم بچوں کے والدین ہی کو خوش نصیب سمجھتی ہے۔ منچندہ نے اپنی اس کہانی میں ایک ایسا ذہنی بحران پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک اِنسان صدیوں سے اپنے اندر محسوس کر رہا ہے۔ کہانی اِرتقا پر پہنچ کر ایک الگ راہ اختیار کرتی ہے۔ سریش اور سوشیل ایک دوسرے کے بہت ہی قریب آجاتے ہیں اور شادی کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ دونوں بچے کم پیدا کرنے کے فیصلے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ یہ صرف ایک سُریش اور سوشیل کا ذہنی کرب نہیں ہے بلکہ ہماری تمام سوسائٹی کو اس کرب نے کھوکھلا بنا دیا ہے۔

''سڑک انصاف کرتی ہے'' میں فیکٹری کے ملازمین اپنی آپ بیتی بیان کرتے ہیں۔ یہ افسانہ بقول عرش صہبائی اردو کا اہم افسانہ ہے[1] جس میں عناصر ترکیبی کا خاص خیال رکھا گیا۔ ''ڈاکٹر''، ''سچ کہو''، ''ہم تمہارے ہیں'' اور ''روش سے ہٹ کر'' بھی ایسے ہی افسانے ہیں جن میں منچندہ نے زندگی کے حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ منچندہ کے ان افسانوں میں سوسائٹی پر گہرا طنز ملتا ہے۔ اُن کے بعض افسانوں میں ایک اِنسان اپنے اندر کا درد محسوس کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اِن افسانوں میں اُنہوں نے اُن مسائل کو پیش کیا ہے جو ایک عام انسان کے مسائل ہیں۔ بعض افسانوں میں وہ خود بھی کردار نبھاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے افسانوں کے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں جن میں خود اُن کی زندگی کے نجی مسائل کی عکاسی ہوتی ہے، مثلاً:-

> ''بن آنگن کے جس مکان میں، میں رہتا ہوں وہ شہر کے دِل یعنی ہارٹ آف سٹی میں واقع ہے۔ اس مکان سے صرف پچاس گز شمال کی جانب ایک گلی بازار میں کُھلتی ہے۔ اس گلی کے دائیں جانب حلوائی کی ایک دُکان ہے جہاں صبح سویرے مردوں، عورتوں اور بچوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ دہی کھانے

[1] کشوری منچندہ: سڑک انصاف کرتی ہے، ص ۸

کے اِتنے شوقین نہ جانے کیوں ہیں جو اس حلوائی کی جھڑکیاں کھانے پر بھی وہیں ڈٹے رہتے ہیں اور بھکاریوں کے کشکول کی طرح سٹین لیس سٹیل کے ڈونگے اور ڈبے ہاتھوں میں لئے ہوئے مچلتی نگاہوں سے اُس کا چہرہ دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر جب وہ اُن کی بے چینی، بے قراری اور بے چہرگی سے محظوظ ہوتے ہوئے طرح طرح کے فقرے چُست کرنے لگتا ہے تو کتنے ہی لوگ اس جملے بازی کو برداشت نہ کرتے ہوئے چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔ مگر جوں ہی وہ جگہ خالی کرتے ہیں دوسرے لوگ فوراً ہی آگے بڑھ جاتے ہیں اور بڑے صبر سے اپنی اپنی باری کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اس باری کے چکر میں اکثر گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جونہی اُس حلوائی کی نگاہ نرم و نازک ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈونگے پر پڑتی ہے وہ سخت اور کرخت ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈونگوں کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔''[1]

(بیوی اور مکان)

''میری شادی ہوئے آج اٹھائیس برس ہو چکے ہیں۔ آپ لوگوں کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ میں نے ابھی میٹرک کا امتحان دیا ہی تھا کہ میری شادی ہو گئی۔ مُجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت مُلک بھر میں آزادی کے چرچے ہو رہے تھے۔ عوام میں ایک عجیب طرح کا جوش پایا جاتا تھا۔ مُلک آزادی کے مندر کی دہلیز پہ کھڑا تھا اور آزادی کی دیوی کے دیدار کے لئے مضطرب و بے چین ہو رہا تھا جبکہ میری آزادی سلب کرنے کے پروگرام بننے شروع ہو گئے تھے۔ ایک خوبصورت اور نازک اندام ہتھکڑی میرے ہاتھوں میں پڑنے والی تھی جو چند ہی دِنوں میں میرے ہاتھوں کا سنگار بن گئی

[1] کشوری منچندہ: 'کہرے کی وادی' ص ۳۲، ۳۳

اور گلے کا ہار بن گئی۔ مگر میں چونکہ ذہنی طور پر ابھی اس غلامی کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے بہت دِنوں تک میں خود پہ یہی احساس طاری کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں بھی آزاد ہوں اور ہمیشہ آزاد ہی رہوں گا۔"[۱]

(احساس کی دھڑکن)

منچندہ کے افسانوں میں جو کردار نظر آتے ہیں، وہ ہمارے جانے پہچانے کردار ہیں جن کا تعلق ہمارے سماج سے ہے۔ یہ کردار اپنا اپنا کام نبھانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ جہاں تک منچندہ کی مکالمہ نگاری کا تعلق ہے۔ وہ اس معاملے میں سنجیدگی سے کام نہیں لے رہے ہیں بلکہ جذبات کے سیلاب میں بہہ کر نہ جانے کون سا رُخ اختیار کرنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ زبان پر قابو نہیں رکھ سکتے ہیں۔ اُن کے دورِ اوّل کے افسانوں میں ایسی بے شمار کوتاہیاں نظر آتی ہیں لیکن اس کے باوصف اُن کے اسلوب کا جہاں تک تعلق ہے اس میں سادگی اور معصومیت پائی جاتی ہے۔ یہی سادگی اور معصومیت اُن کے افسانوں کی ایک خاص خصوصیت ہے۔

۱۔ کشوری منچندہ: احساس کی دھڑکن، ص ۳۱

اُردو کے تئیں ——— ریاست کے ادبی اداروں کا رول

علمی واَدبی اداروں کی افادیت سے انکار نہیں۔ علم وادب کو فروغ دینے میں جہاں اخبارات اور رسائل وجرائد، لائبریریاں اور دانش کدے فعال ثابت ہوسکتے ہیں، وہاں نشریاتی اِداروں، انجمنوں اور اَدبی اور تمدّنی اِداروں کے رول کو کسی بھی صورت میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ریاست جموں وکشمیر اُردو زبان وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں کے علم واَدب، تہذیب وتمدّن اور کلچر کو فروغ دینے میں یہاں کے اخبارات کے ساتھ ساتھ مختلف ادبی، ثقافتی اور تہذیبی اِداروں کا بھی زبردست ہاتھ رہا ہے۔ ریاست میں گزشتہ ایک صدی کے دوران کئی ایسے اِدارے وجود میں آئے جن سے ہمارے کلچر، تہذیب اور اَدب کو بے پناہ وسعت اور ترقی ملی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اَدبی اور تمدّنی ادارے تہذیبی قدروں کے پھیلاؤ، فنکاروں اور ادیبوں کو جمع کرنے اور ان کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لاکر اُن کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنے کے معاملے میں سرگرم رول ادا کرتے ہیں۔ ہمارے علمی وادبی اور تہذیبی ادارے ریاست کے طول وعرض میں وقتاً فوقتاً مشاعروں، مذاکروں، مباحثوں، سمیناروں، سمپوزیموں اور تقاریر کا اہتمام کرتے رہے ہیں، لیکن ان اداروں اور انجمنوں کے ساتھ ساتھ اُردو زبان وادب کو فروغ دینے میں ریاست کے مختلف کالجوں کی طرف سے منعقد کئے گئے ادبی تقاریب

کی پہل کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، جہاں اساتذہ کے ساتھ ساتھ باذوق طلبا چھوٹے چھوٹے ادبی وثقافتی ادارے قائم کرتے رہے۔ یہ ادارے ''بزمِ اَدب'' کے نام سے موسوم تھے[۱]۔ اس کے ساتھ ساتھ ریاست میں اُردو کو فروغ دینے میں محرّم کی مجلسوں کا بھی ہاتھ رہا ہے[۲]۔ اس قسم کی محفلیں جموں اور سری نگر کے مختلف علاقوں میں آراستہ ہوتی تھیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔

ریاست کے علمی وادبی اداروں اور انجمنوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے ہمارے ذہن میں ایک ایسی علمی وادبی انجمن کا نام آتا ہے جو اس صدی کے اوائل میں ''مفرح القلوب'' کے نام سے میر منشی سراج الدین احمد خان نے اپنے چند ہم عصروں چودھری خوشی محمد ناظرؔ، محمد حسن عارف اور مرزا سعد الدین سعدؔ کے اشتراک سے قائم کی اور ریاست میں باضابطہ طور پر ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا[۳]۔ ان ادبی سرگرمیوں نے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس انجمن کی تقاریب میں بعض سرکردہ علمی وادبی شخصیات حصّہ لیتی رہیں جن میں شیخ عبدالقادر، علاّمہ اقبالؔ جیسے سربرآوردہ ادیب بھی شامل ہوتے تھے[۴]۔ یہ انجمن ایک عرصہ تک مشاعروں اور محفلوں کے ذریعے سے علمی وادبی خدمات انجام دیتی رہی۔ انجمن وقتاً فوقتاً ڈل کے پانیوں پر تیرتی ہوئی کشتیوں میں مشاعروں کا اہتمام بھی کرتی رہی اور اس طرح سے خاص وعام میں کشمیر کا یہ علمی وادبی ادارہ مقبول ہو گیا۔

انجمن مفرح القلوب کی ادبی اور علمی سرگرمیاں دیکھ کر ۱۹۰۵ء میں انجمن نصرۃ الاسلام کے نام سے ایک اور ادبی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اِس انجمن کے رُوحِ رواں میر واعظ غلام رسول شاہ صاحب تھے[۵]۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس انجمن نے علم واَدب کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ سماجی، اصلاحی اور دینی خدمات بھی انجام دیں۔ اس کے جلسوں اور مشاعروں میں منشی امیر الدین امیرؔ، صادق علی خان، محمد الدین فوقؔ اور منشی غلام محمد خادمؔ وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ انجمن کے بعض جلسوں میں پنڈت ہرگوپال خستہؔ

۱۔ کشمیر میں اُردو (دُوسرا حصّہ) از: پروفیسر عبدالقادر سروری، ص ۵۷۸
۲۔ کشمیر میں اُردو، از: حبیب کیفوی، ص ۴۴
۳۔ جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما، از: ڈاکٹر برج پریمی، ص ۱۳۳
۴۔ جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما، از: ڈاکٹر برج پریمی، ص ۱۳۳
۵۔ کشمیر میں اُردو، از: حبیب کیفوی، ص ۴۷

بھی شریک ہوتے تھے۔ انجمنِ نصرۃ الاسلام، دراصل لاہور میں قائم کی گئی انجمنِ حمایت الاسلام کے طرز پر چلنے والی انجمن تھی اور اس کے اراکین سر سیّد احمد خان سے متاثر تھے اور ان کا نصب العین کشمیر کے مُسلمانوں کو مغربی تعلیم سے آراستہ کرنا اور اس قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا تھا۔ اِس انجمن نے کشمیر میں علم و ادب کی ترقی و بقا کے لئے اہم رول ادا کیا۔ چنانچہ انجمن کی طرف سے مختلف مقامات پر مدرسے قائم کئے گئے اور لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا کام بھی عمل میں لایا گیا۔

''بزمِ سخن'' ایک اور علمی و ادبی انجمن تھی جو پنڈت دینا ناتھ مستؔ کاشمیری کی کوششوں سے ۱۹۰۴ء میں جموں میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کے ساتھ مستؔ کے ہمعصر اور دوست وشوا ناتھ درماہؔ جموی اور قیس شیروانیؔ بھی وابستہ تھے۔ اِس انجمن کا دائرہ کار پہلے پہل تو جموں تک ہی محدود تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علم و اَدب کے ساتھ لوگوں کی بے پناہ دِلچسپی کو دیکھ کر اس انجمن کی طرف سے سری نگر میں بھی ایک شاخ قائم کی گئی۔ اِس طرح سے اس کا نام بعد میں ''بزمِ سخن جموں و کشمیر'' رکھا گیا۔ انجمن کی ہفتہ وار میٹنگوں میں طرحی کلام پیش کیا جاتا رہا۔ اس انجمن کی طرف سے بعض موقعوں پر شاندار تقاریب کا اہتمام کیا گیا جن میں جوشؔ، ساغرؔ، حفیظؔ، تاجور نجیبؔ آبادی، اخترؔ شیرانی، روشؔ صدیقی، احسان دانش اور قمرؔ جلال آبادی جیسے شعراء حصہ لیتے رہے۔ ''بزمِ سخن'' کے ساتھ ساتھ ''بزمِ مشاعرہ'' بھی جموں میں کافی عرصہ تک علم و ادب کو فروغ دینے میں سرگرم عمل رہی۔ اس کے اجلاس عام طور پر جموں کے عجائب گھر میں ہوا کرتے تھے۔ یہ انجمن ۱۹۱۴ء کے آس پاس جموں میں قائم ہوئی۔ اس کے اراکین میں سردار وزیر محمد خان، صاجزادہ محمد عمر، منشی غلام علی حسرتؔ اور غلام حیدر خان غوریؔ وغیرہ شامل تھے۔ انجمن کی تقاریب میں جو کلام پیش کیا جاتا تھا اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا اس ادارے کی خاص کارکردگی رہی ہے۔ حبیب کیفویؔ اِس انجمن کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:-

> ''یہ بزم ہفتہ وار مشاعروں کے بجائے پندرہ روزہ مشاعرے جموں کے عجائب گھر میں منعقد کرتی۔ اس میں بڑی کثرت سے صاحب ذوق حضرات شرکت کرتے، حکومت کے اعلیٰ عہدیدار بھی شامل ہوتے اور گھنٹوں شعر اور سخن کا دور چلتا رہتا۔ بزم کبھی کبھی اپنے

> مشاعروں میں پڑھا جانے والا کلام کتابچوں میں بھی شائع کرتی جس پر بزمِ سخن کے اراکین کتابچوں پر تنقیدی پمفلٹ شائع کرتے۔ اس طرح بڑی دِلچسپ ادبی بحثیں شروع ہوجاتیں۔''[۱]

یہ انجمن چند برسوں تک علمی وادبی خدمات انجام دیتی رہی۔ چوں کہ اس انجمن کے ساتھ بیشتر سرکاری ملازمین وابستہ تھے۔ اس لئے اس کا شیرازہ اس وقت بکھر گیا جب ان کا تبادلہ ریاست کے دوسرے مقامات پر ہوگیا۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے آس پاس مولانا مُبارک شاہ فطرت گیلانی نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک اور انجمن ''اخوان الصفا'' کی بنیاد ڈالی۔ بعد میں حیرت کاملی اور محمد امین داراب جیسے علماً اس انجمن کے ساتھ وابستہ ہوگئے اور اس میں نئی جان پھونک دی۔ یہ لوگ اُردو کے علاوہ فارسی زبان وادب پر بھی دسترس رکھتے تھے لہٰذا اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شعر گوئی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ریاست جموں وکشمیر میں ادبی انجمنوں اور علمی اداروں کی روایت برقرار رکھنے میں یہاں کے اہلِ علم حضرات پیش پیش رہے ہیں۔ اُنہوں نے اس روایت کو آگے بڑھانے میں ہر دور میں سرگرم حِصّہ لیا اور اُردو کے کاز کو آگے بڑھایا۔ ۱۹۳۶ء میں ملک کے دُوسرے حِصّوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخیں قائم کی گئیں۔ کشمیر میں اس کی بنیاد کا پہلا پتھر مشہور افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی مرحوم نے ۱۹۴۲ء میں رکھا۔ اس انجمن کے پروگرام آگے بڑھانے میں پردیسی کے ساتھ ساتھ اُن کے ہمعصر رامانند ساگر بھی پیش پیش رہے۔ اِبتدا میں اس کی نشستیں پردیسی کے گھر پر ہوا کرتی تھیں[۲] لیکن بعد میں جب اس کا دائرہ وسیع ہوگیا تو یہ نشستیں سری پرتاپ کالج سری نگر کے ہال میں ہونے لگیں۔ انجمن کی تقاریب میں مقامی ادبأ کے ساتھ ساتھ باہر سے تعلق رکھنے والے قلمکار اور شعراُ بھی حصّہ لیا کرتے تھے۔ جن میں خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، دیویندر ستیارتھی، بیدی، محمود ہاشمی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ شامل ہیں۔ اس انجمن کے جلسوں میں شاعر کشمیر مہجور، عبدالستار عاصی، پروفیسر محمود ہاشمی، کنول نین پرواز، قیصر قلندر وغیرہ بھی

۱۔ کشمیر میں اُردو' از: حبیب کیفوی' ص ۵۴

۲۔ جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما' از: ڈاکٹر برج پریمی' ص ۱۳۴-۱۳۵

بڑے شوق سے جایا کرتے تھے اور اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے۔ انجمن نے کشمیر میں اُردو شعر و اَدب کی فضا سازگار بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ ساتھ پرنسپل محمد الدین تاثیر کی قیادت اور رہنمائی میں اُردو سبھا کے نام سے ایس پی کالج سری نگر میں ایک اور ادبی انجمن قائم کی گئی۔ اس کے ممبران باذوق نوجوانوں کے ساتھ ساتھ ریاست کی کئی سرکردہ ادبی شخصیتیں تھیں۔ اس کا مقصد بھی ریاست میں علم و ادب کو فروغ دینا تھا۔ محمد الدین تاثیر خود بھی ایک جانے پہچانے شاعر اور ادیب تھے۔ وہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کی صلاحیتوں سے واقف تھے اور ساتھ ہی ساتھ ادبی محفلوں اور مجالس کے دِلدادہ تھے۔ اُنہوں نے اُردو سبھا کی طرف سے بہت ہی یادگار جلسے منعقد کئے، بڑے شاندار مشاعرے کروائے۔ ایس. پی کالج کی یہ ادبی محفلیں ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

۱۹۴۴ء میں سری نگر کے اندرونی علاقے فتح کدل میں کشمیری زبان کے سرکردہ شاعر مرزا عارف بیگ نے ''بزمِ اَدب'' کے نام سے ایک اور انجمن کا قیام عمل میں لایا۔ اس انجمن نے بھی اُردو کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان و اَدب کو فروغ دینے کے لئے کام کیا۔ اس انجمن نے بھی مشاعروں اور مباحثوں کے ساتھ ساتھ اشاعت کا کام عمل میں لایا۔ چنانچہ ''گلریز'' نام کے رسالے کے ساتھ ساتھ کئی کتابیں ادارے کی طرف سے شائع ہوئیں جن میں ''حبہ خاتون'' اور ''رُباعیاتِ عارف'' قابلِ ذکر ہیں۔[1]

۱۹۴۷ء کے قبائلی حملے کے دوران ریاستی ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں نے کلچرل فرنٹ کے نام سے ایک ثقافتی اور اَدبی محاذ منظم کیا۔ یہ ایک ہنگامی تنظیم تھی، اگرچہ اس میں اَدب سے زیادہ سیاسی مقاصد کارفرما تھے لیکن اس نازک دور میں اس انجمن نے جو کارکردگی دکھائی، اس کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس انجمن کا رول تاریخی بھی رہا ہے اور تعمیری بھی۔ کلچرل فرنٹ کو بعد میں کلچرل کانگریس کا نام دیا گیا۔ اس کے تین شعبے تھے:-

۱- ادیبوں اور شاعروں کا شعبہ

۲- مصوّروں کا شعبہ، اور

۳- تھیٹر کا شعبہ

۱؎ ماہنامہ ''تعمیر'' سری نگر (اقبال و کشمیر اردو ادب نمبر) جلد ۱۱ شمارہ ۲ ۱۹۸۲ء، ص ۱۵۰

چنانچہ انجمن کی طرف سے مشاعروں اور مباحثوں کا انعقاد کیا گیا۔ چونکہ اُردو زبان کو اپنی شیرینی اور مٹھاس کی وجہ سے ہر ایک زبان پر سبقت حاصل ہے اس لئے انجمن کی طرف سے سٹیج پر کھیلا جانے والا اوّلین ڈرامہ اُردو کا ہی تھا جو پروفیسر محمود ہاشمی نے ''کشمیر یہ ہے'' کے نام سے لکھا۔ ڈرامے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے گانے کشمیری زبان میں لکھے گئے۔ اس ڈرامے میں پہلی بار مردوں کے ساتھ ساتھ زنانہ فنکاروں نے حصہ لیا[۱]۔ اسی دور میں پردیسی نے ''شہید شیروانی'' کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا۔ اِس ڈرامے کے گانے شاعر کشمیر مہجورؔ نے لکھے تھے۔ کلچرل فرنٹ کے سرپرست خواجہ غلام محمد صادق تھے اور اس کے روح رواں مشہور ناول نگار اور نقاد شودھان سنگھ چوہان تھے۔ کلچرل فرنٹ یا کلچرل کانگریس کے ساتھ پیر عبدالاحد، غلام رسول رینزو، پیر غیاث الدین، موتی لال مصری، پران ناتھ جلالی، بدری ناتھ نشاطؔ، مدھوسودھن کوثرؔ جیسے دانشوروں اور قلم کاروں کے ساتھ ساتھ چند بزرگ ادیب اور شاعر بھی شامل ہوئے جن میں مہجورؔ اور ماسٹر زندہ کول کے نام پیش پیش ہیں۔ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے جو قلمکار اور دانشور اس جماعت سے وابستہ تھے اُن میں نادمؔ، راہیؔ، کاملؔ، مہندر ناتھ، نور محمد روشنؔ، عزیز ہارون، حبیب کامرانؔ، ارجن دیو مجبورؔ، اختر محی الدینؔ، سوم ناتھ زتشی، تیج بہادر بھانؔ، قیصر قلندرؔ، بنسی نردوشؔ، علی محمد لون، دیپک کول وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اس انجمن کی طرف سے ''آزاد'' کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا رہا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ریاست میں علمی و ادبی اداروں کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ نہ صرف پرائیویٹ طور پر کئی انجمنیں اور علمی ادارے اُبھرے بلکہ سرکاری سطح پر بھی کئی اہم ادارے قائم کئے گئے اور اس طرح سے اُردو شعر و ادب کو زیادہ سے زیادہ فروغ ملا۔ سرکاری اداروں میں جموں اور کشمیر کے ریڈیو اسٹیشن، ٹیلی ویژن سینٹر، جموں اور کشمیر کی یونیورسٹیوں کے اُردو کے شعبے، کلچرل اکادمی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ ادارے ہیں جو اُردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کرتے آئے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں ریڈیو کشمیر سری نگر قائم ہوا۔ اس کی نشریات کا آغاز باضابطہ طور پر اُردو سے ہی ہوا۔ آل انڈیا ریڈیو کی اُردو مجلس کے بعد ریڈیو کشمیر سری نگر ہی ایک ایسا اسٹیشن ہے جو زیادہ سے زیادہ پروگرام اُردو زبان میں نشر کرتا رہا

۱۔ مباحث' از: ڈاکٹر برج پریمی' ص ۹۶

ہے۔ ریڈیو کے اُردو پروگراموں کی ترتیب دینے میں اِبتدأ میں جن اہم شخصیات کا ہاتھ رہا ہے اُن میں خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدیؔ، سہیلؔ عظیم آبادی، کمال احمد صدیقیؔ اور کے. کے. نیرؔ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ پردیسیؔ، ٹھاکر پونچھی، میکشؔ کاشمیری، عبدالحق برقؔ، پران کشور، پشکر بھان، قیصر قلندرؔ، سوم ناتھ سادھوؔ وغیرہ جیسے قلمکاروں نے ڈراموں، موسیقی، خبروں، فیچروں، مباحثوں کا اہتمام کرکے ریڈیائی پروگراموں میں نئی روح پھونک ڈالی اور اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ریڈیو کشمیر سری نگر سے سب سے پہلا اُردو ڈرامہ ''چودہ گولیاں'' کے نام سے نشر ہوا۔ یہ ڈرامہ خواجہ احمد عباس نے لکھا۔ اس کے بعد بے شمار اُردو ڈرامے پیش کئے گئے۔ ان میں سے بعض ڈرامے قومی ایوارڈ کے لئے منتخب ہوئے۔ ڈراموں کے علاوہ ریڈیو کشمیر سری نگر وقتاً فوقتاً آل انڈیا مشاعروں کا بھی اہتمام کرتا رہا۔ یہ روایت تادمِ تحریر جاری وساری ہے۔ ۱۹۷۹ء میں ریڈیو کشمیر کی طرف سے ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں مقامی شعرأ کے ساتھ ساتھ باہر سے آئے ہوئے بعض نامور شعرأ نے حصّہ لیا۔ ریڈیو سے سامعین کی دلچسپی کے لئے اُردو کے مختلف ادبی ثقافتی پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ریڈیو اُردو زبان کی توسیع کے لئے بہت ہی اہم رول ادا کرتا ہے۔ نہ صرف ریڈیو کشمیر سری نگر ہی بلکہ ریڈیو کشمیر جموں اور ریڈیو کشمیر لداخ بھی مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو کی فلاح وبقا کے لئے بڑا مفید کام کررہے ہیں اور اُردو کے معیاری پروگرام نشر کرتے ہیں۔ اب چند برسوں سے ریڈیو جموں کی طرف سے آل انڈیا مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ جن میں ملک کے مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والے شعرأ حصّہ لیتے ہیں۔

ریاستی کلچرل اکادمی بھی اُردو زبان وادب کی ترقی وبقا کے لئے سالہاسال سے کام کرتی آئی ہے۔ یہ ادارہ صدرِ ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ نے ۱۹۵۸ء میں جموں وکشمیر کے آئین کی دفعہ ۱۴۶ کے تحت قائم کیا۔ اس کے صدر ریاست کے وزیرِ اعلیٰ ہیں۔ اکادمی ریاست کے تینوں خطوں کے درمیان تمدنی رشتہ قائم کرنے میں سرگرم رول ادا کرتی ہے اور ریاست جموں وکشمیر کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت لوگوں کے کارناموں کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ اکادمی نے نہ صرف ڈوگری، کشمیری، لداخی، گوجری، پنجابی اور پہاڑی ادب کی ترویج میں نمایاں کام انجام دیا ہے بلکہ اُردو زبان وادب کی ترقی وبقا کے لئے اکادمی کے رول کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس بلند پایہ علمی وادبی ادارے کی

طرف سے اب تک باقی تمام علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو کی درجنوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں کشمیر میں اُردو (تین حصّوں میں) کشمیری زبان اور شاعری، کشمیر میں عربی ادب کی تاریخ، جدید ڈوگری ادب کا ارتقاءُ، انتخابِ اُردو اَدب، محفلِ اقبال، پربت اور پنگھٹ، ریشیات، ساز کی لے تیز کرو، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے ساتھ ساتھ اکادمی کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں اُردو دوماہی جریدہ ''شیرازہ'' کا اجراءُ ہوا۔ جریدے کی ادارت کے فرائض جناب محمد یوسف ٹینگ کو تفویض کئے گئے جنہوں نے قلیل عرصے میں اسے ملک کے مقتدر ادبی رسائل کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ٹینگ صاحب کافی عرصہ اس جریدہ سے منسلک رہے۔ آج کل جناب محمد احمد اندرابی اِس کے مدیر ہیں[1]۔ یہ جریدہ باقاعدگی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اس جریدے کو نہ صرف ریاست کے قلم کاروں اور شاعروں کا تعاون حاصل ہے بلکہ یہ ملک کے مختلف حصّوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوا ہے۔ گزشتہ برسوں میں اس جریدے کے عام شماروں کے علاوہ متعدد خاص نمبر منظرِ عام پر آئے جن میں لل دید نمبر، ثقافت نمبر، نہرو نمبر، شیخ العالم نمبر، پریم چند نمبر، افسانہ نمبر، زور نمبر، اقبال نمبر، حسن نمبر، فوق نمبر، اُردو کانفرنس نمبر، کامگار نمبر، عجائبات نمبر، مغل نمبر، شاہ ہمدان نمبر، صوفیانہ موسیقی نمبر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ شیرازہ کے ساتھ ساتھ اکادمی کی طرف سے ہر سال کے آخر پر ''ہمارا اَدب'' کے نام سے ایک مجلّہ شائع ہوتا ہے۔ جس کے کئی یادگار نمبر جیسے لوکِ ادب نمبر، مشاہیر نمبر (دو جلد) شیرازہ انتخاب نمبر، جموں و کشمیر نمبر (۵ جلد) شخصیات نمبر (۵ جلد) اور اولیاء نمبر (چار جلد) چھپ کر ادبی حلقوں میں دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اکادمی کی طرف سے ایک خوبصورت ''خبرنامہ'' بھی سالہا سال تک شائع ہوتا رہا جس میں اُردو زبان و ادب کے بارے میں مفید معلومات شائع ہوتی رہیں۔ اکادمی ہر سال مختلف ادیبوں کو کتابیں شائع کرنے کے لئے مالی امداد فراہم کرتی ہے۔ بہترین کتاب پر ہر سال انعام دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے اس علمی و ادبی ادارے کی طرف سے اُردو کی کافی ترقی ہوئی ہے۔

دُور درشن کیندر بھی ایک اور ثقافتی ادارہ ہے جو گوجری، ڈوگری، پنجابی، بھدرواہی، کشمیری وغیرہ زبانوں میں خبریں، فیچر، ڈرامے، نظمیں، بحث و مباحثے، گانے وغیرہ شروع سے ہی پیش کرتا رہا ہے۔ ان تمام زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو زبان میں مختلف نوعیت کے پروگرام بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔ سرکاری زبان ہونے کے ناطے دُور درشن کیندر کی نشریات میں کشمیری کے بعد اُردو کو ہی فوقیت حاصل

---

[1] اندرابی صاحب ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ شیرازہ اب [illegible] میں شائع ہوتا ہے۔

ہے۔ چنانچہ ہر ماہ ''دھنک'' کے نام سے ماہانہ اُردو پروگرام دُوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے جو خالص علمی و ادبی نوعیت کا ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے لئے ''نئے چراغ'' اور ریسرچ اسکالروں کے لئے ''عکس و آہنگ'' جیسے اُردو کے پروگرام ایک زمانے سے ٹیلی کاسٹ ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے، فیچر، مشاعرے اور قومی یک جہتی کے موضوع پر بہت سے پروگرام وقتاً فوقتاً دوردرشن کیندر سے پیش ہوتے رہے ہیں، جو خالص علمی و ادبی نوعیت کے پروگرام ہوتے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے یہ پروگرام کافی مقبول ہو رہے ہیں اور اُردو پروگراموں کے ناظرین کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اب صوبہ جموں میں بھی ایک الگ اسٹیشن قائم کیا گیا ہے اور اس نے گزشتہ بارہ سال سے کام کرنا شروع کیا ہے۔ اس کیندر کی طرف سے بھی اُردو کے بعض معیاری اور قابلِ تعریف پروگرام پیش ہو رہے ہیں۔

سری نگر اور جموں یونیورسٹیوں کے پوسٹ گریجویٹ اُردو کے شعبہ جات بھی ریاست میں علم و ادب کے بڑے مراکز میں شمار ہوتے ہیں۔ یہاں اُردو زبان و ادب کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی نے ۱۹۵۸ء سے کام کرنا شروع کیا ہے۔ اس طرح سے آج تک ہزاروں کی تعداد میں طلبأ اور طالبات اُردو کی تعلیم سے مستفید ہوئے۔ ان طلبأ اور طالبات میں بہت سے شاعر، افسانہ نگار، ادیب اور فنکار اُبھرے۔ یہ اس زبان کے ساتھ محبت اور عقیدت کا جذبہ ہی ہے کہ طلبأ اور طالبات میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تحقیق کے میدان میں بڑی تیزی آئی ہے اور اُردو زبان و ادب کے مختلف موضوعات پر سالہا سال سے تحقیقی کام ہوتا رہا ہے۔ علم و اَدب کے جن موضوعات پر آج تک شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی میں تحقیق ہوئی ہے، ان میں درج ذیل موضوعات قابلِ ذکر ہیں:-

''اُردو نظم پر یورپی اثرات''، ''آغا حشر کاشمیری''، ''سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے''، ''اُردو اور کشمیری شاعری میں رُومانیت''، ''اُردو ناول میں کردار نگاری''، ''اُردو تنقید میں غالب شناسی''، ''اُردو تنقید میں اقبال شناسی''، ''اُردو شاعری میں میر کی روایت''، ''۱۹ویں صدی کی اُردو نثر میں سماجی طنز''، ''مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر نگاری''، ''عصمت چغتائی۔ شخصیت اور فن''، ''کشمیری غزل پر اُردو غزل کے اثرات'' وغیرہ وغیرہ۔

شعبے کی طرف سے ''بازیافت'' کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا ہے جس میں ملک کے

مختلف حصّوں سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ پایہ کے محققوں، شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ ریاست کے نامور ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ شعبے کی طرف سے ''آگہی'' کے نام سے ایک خبرنامہ بھی شائع ہوتا ہے۔

شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی بھی ایک باوقار شعبہ ہے۔ یہ بھی علم وادب کا ایک نمائندہ مرکز ہے۔ اس کی عمر اگرچہ شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی کے مقابلے میں کم ہے لیکن اس علمی وادبی ادارے کی کارکردگی صرفِ نظر نہیں کی جاسکتی۔ شعبے کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف علمی وادبی موضوعات پر سیمنار ہوتے ہیں۔ مشاعروں اور مباحثوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اُردو کی ترقی وبقا کے لئے مختلف پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں۔ یہ اُردو زبان وادب سے محبت اور عقیدت کا جذبہ ہی ہے کہ شعبے میں طلبا وطالبات کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مختلف علمی وادبی موضوعات پر تحقیقی کام بھی شروع سے ہی ہوتا رہا ہے۔ اب تین چار سال سے ''تسلسل'' کے نام سے شعبے کی طرف سے ایک سہ ماہی جریدہ بھی شائع ہونے لگا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں علم وادب کے پھیلاؤ اور توسیع کے لئے کشمیر یونیورسٹی کا اقبالیات سے متعلق شعبہ ''اقبال انسٹی ٹیوٹ'' بھی علمی وادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ شعبہ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں آج سے تقریباً بیس سال قبل عمل میں آیا اور اس کے سربراہ برصغیر ہندوپاک کے معروف نقاد، شاعر اور ماہرِ اقبالیات پروفیسر آلِ احمد سرور مقرر ہوئے۔ اُن کی رہنمائی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ ترقی کی راہ پر گامزن رہا۔ انسٹی ٹیوٹ نے سرورؔ صاحب کی سرپرستی میں اقبالیات سے متعلق بہترین لائبریری کا قیام عمل میں لایا۔ اس لائبریری میں اقبال کے فن اور ان کے فلسفے کو سمجھنے کے لئے کتابوں کا ایک نادر خزانہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ اقبالیات کے نام سے ہر سال ایک مجلّہ شائع ہوتا ہے۔ اس مجلّہ میں اقبالؔ سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں؛ جن میں اقبال کے فکر وفن کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس مجلّہ نے نہ صرف ملک میں بلکہ برصغیر ہندوپاک کے علمی وادبی حلقوں میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ اقبال کے مختلف پہلوؤں پر سیمنار کرانا اور کتابیں شائع کرنا اس علمی وادبی ادارے کی خاص کارکردگی رہی ہے۔ اقبال کے فکر وفن پر اب تک تقریباً دو درجن سے زائد طلبا اور طالبات تحقیق کرچکے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کے اطلاعات کے محکمے کی کارکردگی اگرچہ اُردو زبان واَدب تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ ایک وسیع محکمہ ہے، لیکن پھر بھی اُردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں اس محکمہ کے رول کو

فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ محکمہ کی طرف سے سالہا سال سے ایک جریدہ ماہنامہ ''تعمیر'' شائع ہوتا رہا۔ عام شماروں کے ساتھ ساتھ اس جریدے کے کئی شاندار نمبر بھی نکالے گئے جن میں مہجور نمبر، آزاد نمبر، پریم چند نمبر، جموں و کشمیر اُردو ادب نمبر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ماہنامہ ''تعمیر'' سب سے پہلے ۱۹۵۱ء میں معروف سیاستدان، دانشور اور ادیب مرحوم شمیم احمد شمیم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اُن کے بعد ادارت کے فرائضِ نامور ادیب محمد یوسف ٹینگ انجام دیتے رہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سب سے پہلے اس رسالے کی ادارت دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی کو سونپ دی گئی تھی۔ ان کی ادارت میں ''تعمیر'' کے ایک یا دو شمارے ہی شائع ہوئے۔ چند برسوں تک اس کی ادارت غلام نبی بابا، انصاری اور خالد بشیر بھی کرتے رہے۔ یہ رسالہ کچھ مدت تک بند ہوگیا تھا لیکن اب کئی برس سے یہ رسالہ پھر سے شائع ہونے لگا ہے۔ محکمہ اطلاعات کی طرف سے انگریزی اور ہندی زبانوں میں ''کشمیر ٹوڈے'' اور ''یوجنا'' جیسے رسائل بھی اس ادارے کی طرف سے شائع ہوتے ہیں۔ یہ ادارہ ''اطلاعات'' کے نام سے ایک خبر نامہ بھی شائع کرتا رہا ہے اور ایک ہفتہ وار اخبار ''مکتوب'' بھی۔ اس محکمے کی طرف سے ابھی چند سال قبل پونچھ کے فوارہ باغ میں اُردو کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر کی برسی کے موقعہ پر ایک عظیم الشان تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریباً میں ریاست کے ادیبوں، دانشوروں اور قلم کاروں نے اس عظیم افسانہ نگار کی شخصیت اور فن پر مقالے پیش کئے اور اس طرح سے اُنہیں شاندار خراجِ عقیدت ادا کیا۔ محکمہ نے اس باغ میں کرشن چندر کا بُت نصب کر کے اُردو نوازی کا پورا پورا ثبوت فراہم کیا ہے۔

ریاست کے عجائب گھر اور ڈوگرہ آرٹ گیلری بھی علم و ادب کے لحاظ سے کم اہمیت کے حامل نہیں۔ ان اداروں میں ہند عہد، بودھ عہد کے علاوہ افغانوں، مغلوں، سکھوں اور ڈوگروں کے عہد کے قدیم ترین آثار دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان اداروں میں مجسمہ سازی اور مصوری کے اعلیٰ نمونے بھی ملتے ہیں۔ مختلف قدیم آلہ جات اور مورتیاں وغیرہ بھی کچھ اس طرح سے سجائی گئی ہیں کہ قدیم تہذیب سے متعلق بے شمار معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ ان تمام علمی و ادبی اور تہذیبی اداروں کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی ادارے ہیں جن کی اُردو زبان و ادب کے تئیں خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ ایسے اداروں میں کشمیر یونیورسٹی کا سینٹرل ایشین سٹڈیز سنٹر، جموں اور کشمیر یونیورسٹیوں کے ہندی، سنسکرت، ڈوگری، بودھی، فارسی، کشمیر اور ہسٹری کے شعبہ جات وغیرہ۔ ان شعبوں کی طرف سے بھی بڑا اہم اور قابلِ قدر تحقیقی کام

ہو رہا ہے اور اُردو میں تواریخی موضوعات پر تحقیق کرنے والوں کی راہیں استوار ہوئی ہیں۔

آزادی کے بعد کی سطح پر جن علمی وادبی اداروں اور انجمنوں نے وقتاً فوقتاً علمی وادبی تقاریب کا انعقاد کیا، ان میں حلقہ علم واَدب خانیار، ہندی سنسد گنپت یار، انجمنِ اربابِ ذوق سری نگر، انجمنِ اَدب بڈگام، انجمن ترقی اُردو اَدب، سیمابی ادبی انجمن، کشمیر کلچرل سوسائٹی، کشمیر کلچرل لیگ سری نگر جیسی انجمنوں اور ادبی اداروں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان اداروں نے وقتاً فوقتاً ریاست میں اُردو زبان وادب کی ترقی اور اس کے فروغ کے لئے بہت مفید کام کیا۔ موجودہ دور میں اقبال اکادمی سری نگر، انجمن فروغ اُردو جموں، آل انڈیا ہندی اُردو سنگم سری نگر، بزم شعرأ سری نگر، ادبی کنج جموں، جموں و کشمیر اُردو فورم جموں، برج پریمی میموریل کمیٹی جموں، محروم میموریل سوسائٹی جموں، رساجاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی جموں، بزمِ فریدیہ بھدرواہ، بزمِ اَدب کشتواڑ، تلاشِ ادب سرینگر، اقبال بزمِ ادب بھدرواہ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ یہ علمی واَدبی ادارے اور انجمنیں اُردو زبان واَدب کو وسعت دینے میں مصروف ہیں۔

انجمنِ اربابِ ذوق سرینگر ۱۹۵۷ء میں قائم کی گئی۔ اس کے سرگرم اراکین میں تیج بہادر بھان، برج پریمی، وجیہہ احمد اندرابی، حکیم منظور اور مخمور حسین بدخشی شامل تھے۔ یہ انجمن نہ صرف مشاعرے، محفلِ افسانہ اور محفلِ مقالات کا اہتمام کرتی رہی بلکہ موسیقی کی محفلیں بھی منعقد کرتی رہی۔

اُسی زمانے کے آس پاس ہندی سنسد کے نام سے گنپت یار سرینگر میں ایک اور ادبی تنظیم قائم کی گئی۔ اس تنظیم کے صدر ہندی زبان کے ایک مستند ادیب دسنت تیجسوی تھے اور سیکریٹری کے فرائض برج پریمی انجام دیتے رہے ــــ یہ ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی مختلف ادبی پروگراموں کا انعقاد کرتی تھی۔

انجمنِ اَدب بڈگام بھی مقامی ادیبوں کی کوششوں سے قائم ہوئی۔ اس کے صدر فاروق بڈگامی تھے۔ انجمن ترقی اُردو ادب سرینگر بھی مقامی ادیبوں کے تعاون سے ۱۹۵۴ء میں قائم ہوئی۔ موجودہ دور میں بھی ریاستی سطح پر کئی انجمنیں اور علمی وادبی ادارے کام کر رہے ہیں، جن میں اقبال اکادمی کی طرف سے سری نگر میں چند یادگار جلسے کئے گئے۔ اس ادارے کی طرف سے علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے فن پر کئی کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست سے تعلق رکھنے والے مقتدر شعرأ اور ادبا کے ادبی کارناموں پر بھی بعض اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں مرزا عارف اور محمد امین بجھ کے ادبی کارناموں پر کتابیں شامل ہیں۔ اس ادارے کے روحِ رواں بشیر احمد نحوی ہیں۔

آل انڈیا ہندی سنگم شاخ سری نگر کی ادبی خِدمات بھی کم اہم نہیں ہیں۔ اس انجمن کا صدر دفتر لکھنؤ (یو پی) میں ہے۔ سنگم نے سری نگر کے گرد و نواح میں چند یادگار ادبی محفلیں منعقد کیں۔ اس انجمن کی طرف سے ۱۹۷۶ء میں ایک شاندار آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مقامی شعرأ کے علاوہ مُلک کے دُوسرے حصّوں سے آئے ہوئے بعض اہم شعرأ نے حصّہ لیا۔ اس تاریخی تقریب میں ریاست سے تعلق رکھنے والے بعض اُردو اور ہندی ادیبوں میں ایوارڈ تقسیم کئے گئے۔ سنگم کے سرپرستِ اعلیٰ اُس وقت کے وزیرِ اعلیٰ (مرحوم) شیخ محمد عبداللہ تھے۔ سنگم کی طرف سے مشہور سیاستدان اور دانشور آنجہانی ڈی. پی. دھر پر ایک سوونیئر بھی شائع ہوا۔ اس شاندار تقریب کی کامیابی کا سہرا نذیر احمد نظیر اور پریمی رومانی کے سر باندھا جا سکتا ہے جو اِس انجمن کے جنرل سیکرٹری اور سیکرٹری رہے ہیں۔

برج پریمی میموریل کمیٹی جموں بھی ایک علمی و ادبی ادارہ ہے۔ یہ ادارہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ریاست کے معروف ادیب اور نامور نقاد ڈاکٹر برج پریمی کے اِنتقال کے بعد وجود میں آیا۔ اس ادارے کی بنیاد پروفیسر ظہور الدین، پشکر ناتھ، عرش صہبائی، آنند لہر اور پریمی رومانی نے رکھی۔ چنانچہ اس ادبی اور علمی تنظیم کی طرف سے پہلی ادبی تقریب جموں کے جاگرتی نکیتن اسکول میں منعقد ہوئی جس میں برج پریمی کی پہلی برسی کے موقعہ پر ان کی شخصیت اور فن سے متعلق مقالات پیش کئے گئے۔ یہ مقالات بعد میں کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔ اس جلسے میں ایک تاریخ ساز شخصیت پروفیسر کُندن لال نے بھی شرکت کی جو برسہا برس تک لالہ ملک راج صراف کے بچوں کے رسالے "رتن" کی ادارت کرتے رہے۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے برج پریمی کے غیر مطبوعہ مسودات کو کتابی شکل میں شائع کیا جو قابلِ مطالعہ ہیں۔

ادبی کُنج جموں کی ایک اور ادبی انجمن ہے جو گذشتہ چند برسوں سے ادبی پروگرام منعقد کرتی رہی ہے۔ یہ انجمن نہ صرف اُردو کی ترقی و بقا کے لئے کام کر رہی ہے بلکہ مختلف زبانوں کے ادیب اور شاعر اس کی تقریبات میں حصّہ لیتے ہیں اور سامعین کو محظوظ کرتے ہیں۔ اس انجمن کی نشستیں باقاعدگی کے ساتھ شاستری میموریل اسکول تالاب تلو جموں میں منعقد ہوتی ہیں۔ اوپی شرما سارتھی اور شام طالب اس انجمن کے رُوحِ رواں ہیں۔

جموں و کشمیر اُردو فورم ریاست کی ایک اور فعال ادبی انجمن ہے جو اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے ۱۹۸۶ء سے کام کر رہی ہے۔ اُردو فورم کے بانی صدر امین بنجارا تھے اور سرپرست

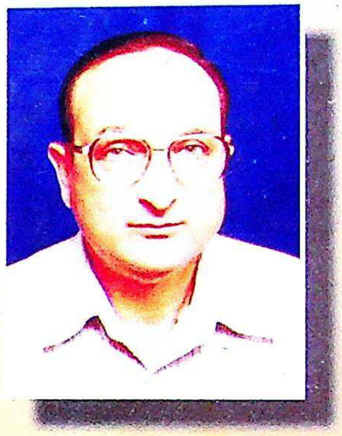
اعلیٰ آنجہانی ماسٹر موہن لال گپتا' جو مجاہدِ آزادی ہونے کے ساتھ ساتھ گاندھیائی طرزِ فکر کے حامی تھے۔
فورم کے زیرِ اہتمام نہ صرف بہت سے علمی و ادبی پروگرام منعقد کئے گئے بلکہ وقتاً فوقتاً نئی اور تازہ تصانیف بھی اجرا کی گئیں۔ ۱۹۸۶ء سے لے کر اب تک اُردو فورم نے بیسیوں تقاریب کا اہتمام کیا ہے جن میں یومِ اُردو، ایک روزہ جشنِ آزاد اور آبروئے ادب ایوارڈ کی تقریب، ایک روزہ جشنِ خلیق انجم اور آبروئے اَدب ایوارڈ کی تقریب، شامِ غزل، کرشن چندر سمینار، ایک ادیب سے ملاقات: محمد یوسف ٹینگ، یومِ سرسید، یومِ اقبال اُردو کوئز جیسی شاندار تقاریب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس انجمن نے شمیم احمد شمیم، موہن یاور، مہندر ناتھ، قیصر قلندر، مرزا عارف، اور ظہور الدین کی شخصیت اور فن پر بھی ادبی محفلیں منعقد کروائیں۔ فورم نے ۱۹۸۹ء میں پہلی بار آواز دی کہ ریاست میں اُردو اکادمی کا قیام عمل میں لایا جائے اور پھر ہر برس کی اُردو کانفرنس میں اس آواز کی بازگشت سُنائی دیتی رہی۔ بالآخر یکم مئی ۱۹۹۶ء کو اُردو فورم کے ایک عظیم الشان جلسے میں ریاست کے وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ریاست میں اُردو اکادمی کے قیام کا اعلان کیا' جس کا نہ صرف ریاستی بلکہ مُلک گیر پیمانے پر استقبال ہوا۔ برسہا برس تک اُردو فورم کا صدر رہنے کے بعد امین بنجارا نومبر ۲۰۰۰ء میں مستعفی ہوگئے اور ولی محمد بھٹ اسیر کشتواڑی اس وقت اس انجمن کے صدر ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ ادیب شاعر اور ماہرِ اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد، نامور صحافی وید بھسین' ڈاکٹر ظہور الدین' نور الزماں صدیقی نور (مرحوم)' خالد حسین' یٰسین بیگ' ڈاکٹر شہاب عنایت ملک' پروفیسر خورشید احمد صدیقی' آنند لہر' رہبر جدید' کے کے شاکر' بیتاب جے پوری' شام طالب' مالک رام آنند' امین بانہالی' پریمی رُومانی' اوتار سنگھ چندن' مالک رام آنند' خورشید کاظمی' ڈاکٹر آر کے مشرا' پرتپال سنگھ بیتاب' عرش صہبائی' پرواز قریشی اور کرنل ہمدم صحرائی وغیرہ اُردو فورم سے گہرے طور وابستہ ہیں۔

انجمن فروغ اُردو جموں بھی ایک عرصے سے اُردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ انجمن کے دفتر واقع دانش کدہ جموں میں ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ علمی و ادبی نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جن میں ریاست کے ادیب، شاعر اور دانشور پابندی کے ساتھ حصّہ لیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی انجمن کی طرف سے طرحی مشاعرے بھی ہوا کرتے ہیں اور محفلِ مقالات اور محفلِ افسانہ کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ شعری نشستوں میں شعرا حضرات اپنی اپنی نظمیں اور غزلیں پیش کرتے ہیں۔ افسانوں اور نظموں پر تنقید بھی ہوتی ہے۔ پروفیسر عابد پیشاوری (مرحوم) نور الزماں صدیقی نور (مرحوم) پروفیسر ظہور الدین،

مالک رام آنند، خورشید کاظمی، خالد حُسین وغیرہ اس انجمن سے وابستہ ہیں۔

رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی' جموں گزشتہ آٹھ برس سے کام کر رہی ہے۔ اس سوسائٹی کی طرف سے کئی ادبی جلسے منعقد کئے گئے جن میں نہ صرف جموں کے ادیب ہی حصّہ لیتے رہے ہیں بلکہ دہلی، علی گڑھ اور سری نگر سے تعلق رکھنے والے خاص مہمان ادیب بھی شرکت کرتے رہے۔ سوسائٹی کی طرف سے مشاعرے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ ریاست کے صحافیوں اور ادیبوں کو ہر سال سوسائٹی کی جانب سے ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ پروفیسر ظہور الدین، وید بھسین، ڈاکٹر شہاب عنایت ملک وغیرہ اس انجمن سے وابستہ ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں اُردو کے تئیں ریاست کے تمام علمی و ادبی اداروں کی خدمات پر روشنی ڈالنا ناممکن ہے۔ لہٰذا صرف چند نمایاں علمی و ادبی اداروں کی کارگزاری پر ہی اِکتفا کیا گیا ہے۔



''پیش رفت'' ڈاکٹر پریمی رُومانی کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس میں اُنھوں نے اقبال، پریم ناتھ پردیسی، جگن ناتھ آزاد، ٹیگور، دینا ناتھ مست کاشمیری، میر غلام رسول نازکی، مظہر امام، شام لال ایمہ، موتی لال ساقی، بنسی نردوش اور کشوری منچندہ کی شخصیت اور فن کا احاطہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض ایسی شخصیات بھی ہیں جن کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں، یہ ایک خلا ہے، جس کو ڈاکٹر پریمی نے پُر کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر پریمی سہل انگاری میں یقین نہیں رکھتے۔ وہ نہ صرف مشہور اہلِ قلم و اہلِ فن کے بارے میں بڑے دِلآویز مضامین لکھتے ہیں بلکہ نسبتاً کم شہرت یافتہ شخصیات کے بارے میں بھی بڑی دِلچسپ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر پریمی نے اُردو اور کشمیری زبان کے بعض اہم تخلیق کاروں کی شخصیت اور فن کے بارے میں بھی ہمیں روشناس کرایا ہے۔ اس طرح سے نہ صرف وہ علم و ادب کی ہی خدمت کرتے ہیں بلکہ اپنی مٹی کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر پریمی اس سلسلے کو جاری رکھیں گے تو اُن کی ایک بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی۔

پشکر ناتھ

۲۹ر ستمبر ۲۰۰۲ء

جموں (توی)